



تیسرا رنگ



مکڑور حال

کاشف زبیر

اُس نوجوان کا فسانہ عزم و ہمت جو بہترین منصوبہ ساز تھا لیکن اس کی یہ منصوبہ سازیاں عمل کی حدود میں کبھی داخل نہیں ہوتی تھیں۔ صرف زبانی طور پر دوستوں کو وہ اپنے بتائے ہوئے منصوبوں سے مرعوب کر کے خوش ہو لیتا تھا کیوں کہ بنیادی طور پر جرم پسند نہ تھا لیکن اُسے یہ معلوم نہ تھا کہ کچھ جرم پیشہ بھی اُس کی صلاحیتوں سے فائدہ اٹھانے کے بارے میں سوچ سکتے ہیں اور اُسے ایک ایسے جکڑ میں پھنسا سکتے ہیں جو بالآخر اُسے جیل کی سلاخوں کے پیچھے پہنچا دے۔

مثبت سوچ کے مالک ایک نوجوان کے معنی دھندوں میں پھنسنے کی دلچسپ داد

”یہ باتیں گلی میں کھڑے ہو کر کرنے کی نہیں ہیں، تم اندر آؤ۔“ قدوسی صاحب نے اپنے گھر کا دروازہ کھولا ”آپ بھی آئیے مضطرب صاحب۔“ انہوں نے لومڑ سے کہا۔ شاید وہ کوئی شاعر تھا اور مضطرب اس کا تخلص تھا۔ وہ مجھے خونی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

”میاں جمالنکیر ٹھنڈا چلے گا یا گرم۔ میرا خیال ہے موسم کی مناسبت سے چائے صحیح رہے گی۔“

”کچھ نہیں قدوسی صاحب۔ میں اس وقت صرف شبنم اور حنا کے بارے میں جاننا چاہتا ہوں۔“

وہ چند لمحے حیرت سے مجھے دیکھتے رہے ”اب تم ان کے بارے میں کیا جاننا چاہتے ہو؟“

”اب سے آپ کی کیا مراد ہے؟“ میں نے خفگی سے کہا۔

”کیا جیل جانے والا اپنے بیوی بچوں کے بارے میں نہیں پوچھ سکتا۔“

”میرا یہ مطلب نہیں ہے۔ جب تم نے شبنم کو طلاق دے دی ہے تو پھر اس کے بارے میں پوچھنا۔۔۔“

”طلاق!“ میں چیخ اٹھا ”قدوسی صاحب آپ کا دماغ درست ہے۔ میں نے شبنم کو طلاق نہیں دی۔“

وہ دم بخود سے میری شکل دیکھ رہے تھے ”عجیب بات کر رہے ہو لیکن ذرا ٹھہرو۔“

وہ اٹھ کر اندر گئے اور چند منٹ بعد واپس آئے تو ان کے ہاتھ میں ایک لفافہ تھا ”یہ شبنم دے گئی تھی تمہارے لیے۔ جب وہ مکان مضطرب صاحب کو فروخت کر کے یہاں سے جا رہی تھی۔“

میں نے بے تابی سے لفافہ الٹ دیا۔ اس میں سے بہت سارے کاغذات نکل کر بکھر گئے۔ میرے تعلیمی سرٹیفکیٹ

اس روز پہلا صدمہ مجھے مکان پر سے اپنے نام کی تختی غائب دیکھ کر ہوا۔ جس پر خوش خطی سے نور الدین جمالنکیر رقم تھا۔ دوسرا صدمہ اس وقت اٹھانا پڑا۔ جب دستک کے جواب میں شبنم کے بجائے اندر سے لومڑ نما شخص برآمد ہوا۔ ”کس سے ملنا ہے؟“ اس نے بد مزاجی سے پوچھا۔

ایک اجنبی کو اپنے گھر میں دیکھ کر میرا طیش بڑھنے لگا۔ ”شبنم سے، جو یہاں رہتی ہے۔“

”یہاں کوئی شبنم نہیں رہتی۔“ اس نے رکھائی سے کہہ کر دروازہ بند کرنا چاہا۔

میرا پیمانہ صبر جواب دے گیا۔ میں نے اس کی گدھ جیسی گردن سے پکڑ کر اسے باہر بھیج لیا ”لومڑ کی اولاد۔ شرافت سے مجھے بتاؤ، اس مکان میں رہنے والی شبنم اور اس کی بچی کہاں ہے اور تم یہاں کیا کر رہے ہو؟“

”لوگوں، دوڑو بچاؤ۔“ غیر متوقع طور پر اس نے گلا پھاڑ کر کہا ”یہ مجھے قتل کرنے آیا ہے۔“

آن واحد میں پورا محلہ وہاں جمع ہو گیا۔ جیسے اس لومڑ کی پکار کا منتظر تھا۔ میں نے لوگوں کی پروا کیے بغیر اسے جھنجھوڑا۔

”تم نے ٹھیک کہا۔ اگر تم نے میرے سوال کا جواب نہیں دیا تو تھیک دو منٹ بعد تم مقتول کھلاؤ گے۔“

”یہ تو جمانکیر ہے۔“ اچانک جھوم میں سے کوئی بولا۔ وہ لوگوں کو ہٹاتا ہوا سامنے آیا تو میں نے پہچان لیا۔ یہ میرے پڑوسی قدوسی صاحب تھے ”تم جمانکیر ہی ہو؟“ انہوں نے بغور میرا معائنہ کیا۔

”خوب پہچانا۔“ میرا لہجہ تلخ ہو گیا ”اب یہ بھی بتا دیجئے کہ میری بیوی اور بچی کہاں ہے اور یہ لومڑ یہاں میرے مکان میں کیا کر رہا ہے۔“

کوئیں، کتوں اور اس قسم کے جانوروں کو کھلا دوں۔“
میری ٹانگیں متحرک تھیں اور ذہن اس سے بھی زیادہ
تیز رفتاری سے سوچ رہا تھا۔



ہر شخص کی زندگی میں ایک ٹرننگ پوائنٹ آتا ہے۔
جہاں سے اس کی زندگی کے دھلے کارخ بدل جاتا ہے۔ کبھی
بلندیوں کی جانب اور کبھی تباہی کی طرف۔ میں اپنا ٹرننگ
پوائنٹ اس لمحے کو کہوں گا جب میں نے شبتم خان بنت
اشفاق خان کو ایک تقریب میں دیکھا تھا۔ اس وقت میں ایک
کمپیوٹر پروگرامر تھا۔ ایک اچھے لباس کا بہترین ملازم تھا، خوش
پوش نوجوان تھا اور کئی دوشیزاؤں کا خواب تھا مگر اس لمحے
کے بعد میں صرف ایک مصنوعی سیارہ رہ گیا۔ جس کی زندگی
کا مقصد اپنے مقصد حیات کے گرد گردش کرنا تھا اور یہ محور
شبتم تھی۔ جس کے حسن جاں سوز نے میری عقل کے نشیمن
کو جلا کر خاک کر دیا تھا۔ اس کا باب اشفاق خان کسٹم کے
محکمے میں تھا اور وہاں کی روایات کے عین مطابق اس کی
انگلیاں گھی میں اور سر کڑا ہی میں ہوتا تھا۔ ظاہر ہے کہ شبتم
بہت ناز و نعم میں پلی گئی تھی۔ مگر اس کے ساتھ شاید یہ میری
بد قسمتی تھی کہ کیوپیڈ نے ہم دونوں کو ایک ہی تیر کا نشانہ بنایا
تھا۔ لہذا جب میرے والدین میرے اصرار کے آگے اور
شبتم کے والد اس کی دھمکیوں کے آگے جھکے تو انہوں نے
ہمیں پہلے ہی خبردار کر دیا تھا کہ ہم آپس میں خوش نہیں رہیں
گے مگر۔۔۔ کہتے ہیں جس کو عشق... خلل ہے دماغ کا، تو شاعر
نے یہ بے سبب نہیں کہا ہے۔ اس وقت ہمیں سوائے ایک
دوسرے کے دنیا کی کسی چیز سے غرض نہیں تھی۔ شادی کے
ابتدائی کچھ مہینے بھی اسی سرشاری میں گزرے مگر اس کے
بعد رفتہ رفتہ میری اور شبتم کی آنکھیں کھلنے لگیں۔ وہ مجھ سے
جس طرز زندگی اور آسائشوں کی طلب گار تھی، میں وہ اسے
دے نہیں سکتا تھا۔ اسے کم از کم ایک ہزار گز کا عالی شان
بنگلا درکار تھا جبکہ میرے پاس ایک سو بیس گز کا گھر تھا۔ اسے
ہزار سی سی کی کار چاہیے تھی اور میرے پاس ایک سو پچیس
سی سی کی موٹر سائیکل تھی۔ اسے صرف اپنے خرچ کے لیے
اتنی رقم درکار تھی جو میری تنخواہ کو دو سے ضرب دینے کے
بعد ہی حاصل ہو سکتی تھی۔ اس کا نتیجہ کھینچا تانی کی شکل میں
 نکلا۔ اس نے مجھے اپنے باپ کے محکمے میں نوکری حاصل
کرنے کی ترغیب دی لیکن وہاں تنخواہ کچھ نہیں تھی اور حرام
میں کھانا نہیں چاہتا تھا۔ پھر کمپیوٹر میری پسندیدہ لائن تھی۔
اسے ترک کرنے کا میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ اس کے
باوجود مجھے احساس تھا کہ شبتم نے میری محبت میں قربانی دی

دستاویزات، پاسپورٹ اور دو فوٹو کاپیاں ایک طلاق نامے کی
تھی۔ جس کی رو سے میں نے بقیہ کی ہوش و حواس اپنی منکوحہ
شبتم اشفاق ولد اشفاق خان کو تین دفعہ طلاق دے دی تھی
اور حق مہر میں اپنا مکان اس کے نام کر دیا تھا۔ ساتھ ہی ایک
پاور آف اٹارنی کی کاپی تھی جو میں نے شبتم کو دی تھی۔
”یہ سب جھوٹ ہے۔“ میں نے کاغذات اٹھا کر دیوار
پر دے مارے ”میں نے اس حرافہ کو طلاق نہیں دی اور نہ
ہی اپنا مکان بیچنے کا اختیار دیا تھا۔“
”تو کیا یہ دستخط تمہارے نہیں ہیں۔“ قدوسی صاحب
نے طلاق نامے کی فوٹو کاپی میری طرف بڑھائی۔
”دستخط۔ تو میرے ہی ہیں۔۔۔ لیکن میں نے شبتم کو طلاق
نہیں دی مگر اس کے پاس میرے سائن۔۔۔“ میں خود کلامی کے
انداز میں بولا۔

قدوسی صاحب جہاں دیدہ شخص تھے۔ وہ سمجھ گئے کہ
میرے ساتھ دھوکا ہوا ہے اور دھوکا کرنے والی میری ذاتی
بیوی تھی۔ اس نے مجھ سے طلاق کے کاغذات اور مکان کی
پاور آف اٹارنی پر سائن کرائے اور مکان بیچ کر نکل گئی مگر
گماں اور کس کے ساتھ؟ میں نے اپنی ہتھیلی پر مکا مارا اور
اس کے ساتھ ہی جیسے سب کچھ میرے سامنے عیاں ہو گیا۔
اس سازش میں شبتم کے ساتھ میرا وکیل شہزاد عباسی برابر کا
شریک تھا۔ یہ کاغذات پر دستخط کرنے والا کام وہی کر سکتا تھا
کیونکہ مجھے اچھی طرح یاد تھا کہ جب مجھ پر مقدمہ چل رہا تھا
تو اس دوران میں اس نے متعدد بار کاغذوں پر مجھ سے دستخط
کرائے تھے۔ اکثر وہ بیک وقت کئی درجن کاغذوں پر دستخط
کراتا تھا اور میرے لیے فرداً فرداً سب کو پڑھنا ناممکن تھا۔
”مجھے تم سے ہمدردی ہے میاں جہانگیر۔“ قدوسی
صاحب نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا تو میں چونک گیا۔
”شکریہ قدوسی صاحب۔“ میں شاید مسکرایا تھا ”زندگی
اسی کا نام ہے، اچھا اب مجھے اجازت دیجئے۔“

”ایسے کیسے میاں، تم ہمارے پڑوسی رہے ہو اور اتنے
عرصے بعد مل رہے ہو۔ کم از کم چائے تو پی کر جاؤ۔“
بڑی مشکل سے میں قدوسی صاحب سے جان چھڑا کر
وہاں سے نکلا۔ میں خالی ذہن کے ساتھ سمت کالین کے بغیر
چل پڑا۔ میرے ذہن میں بار بار دو نام ابھر رہے تھے شبتم اور
شہزاد اور پھر میرے دماغ میں کچھ اس قسم کے خیالات آنے
لگے۔

”میں شبتم کو قتل کر دوں۔۔۔“

”نہیں شہزاد کو اغتال پر مجبور کر دوں۔“

”نہیں۔ ان دونوں کے ٹکڑے کر کے انہیں چیل“

تھا۔ جس کی وہ متحمل نہیں ہو سکتی تھی۔

میں بچپن سے سریت کا عاشق تھا۔ ابتدا ابن صفی کے ناولوں سے کی۔ عمران اور کرئل فریدی کے کارنامے مجھے اتنا پرجوش کر دیتے کہ خود میرا بھی دل چاہتا کہ اس قسم کے کارنامے انجام دوں لیکن ظاہر ہے کہ میرے پاس نہ تو عمران جیسا ذہن تھا اور نہ فریدی جیسا عزم۔ قدرے بڑا ہونے کے بعد میرا رخ مغربی ادب کی طرف ہو گیا۔ جاسوسی اور جرائم پر مبنی ناول اور فلمیں میری کمزوری بن گئے تھے۔ آپ کہہ سکتے ہیں کہ جرم اور مجرم سے مجھے قدرتی دلچسپی تھی لیکن جرائم کو میں صرف ایک کیس کے طور پر پسند کرتا تھا کہ جرم کے طور پر۔ آپ اسے تفتیشی انداز بھی کہہ سکتے ہیں۔

اتفاق سے آفس میں جو گروپ ملاؤہ بھی میرے جیسے شوق رکھتا تھا۔ شہر میں لگنے والی ہر تھل فلم ہم باقاعدگی سے دیکھتے تھے۔ اس کے علاوہ مسٹری ناول ہم اکثر پڑھتے اور پھر ان پر تبصرے کرتے تھے۔ ایک دن باتوں باتوں میں معاملہ مکمل جرم کی طرف مڑ گیا۔ میرا استدلال تھا کہ مکمل جرم موجود ہے۔ یعنی مجرم اگر ذہانت سے کام لے تو وہ ناممکن قسم کے جرائم بھی بغیر پولیس کی گرفت میں آئے کر سکتا ہے۔ اس کے برعکس میرے آفس کے ساتھی عرفان کا نظریہ تھا کہ مکمل جرم کا کیس وجود نہیں تھا اور مجرم محض اتفاقات یا پولیس کی نااہلی کی وجہ سے بچے رہتے تھے۔ اتفاقات کے باعث مکمل

ہے۔ اپنے باپ کی پراسٹس کو ٹھنی چھوڑ کر میرے ایک سو بیس گز کے گھر میں آگئی ہے۔

میں نے اضافی آمدنی کے لیے ہاتھ پاؤں مارنا شروع کیے اور ایک پی سی پر گھر میں نجی طور پر دوسری کمپنیوں اور اداروں کے لیے پروگرام تیار کرنے لگا۔ اس سے آمدنی میں خاطر خواہ اضافہ ہوا مگر یہ آمدنی بھی شبنم کی خواہشات کا منہ بھرنے سے قاصر تھی۔ ابتدائی ایام جو ہم نے ایک سرشاری کی سی کیفیت میں گزارے تھے، اس کا نتیجہ شادی کے ایک سال کے اندر حنا کی شکل میں برآمد ہو گیا۔ والدہ جیسے پوتی کی آمد کی منتظر تھیں۔ وہ دل کے دورے میں انتقال کر گئیں۔ والد صاحب کی ان سے محبت مثالی تھی۔ لہذا ایک سال بعد وہ بھی ان کے پیچھے تشریف لے گئے اور مجھے حالات اور شبنم کا مقابلہ کرنے کے لیے اکیلا چھوڑ گئے۔ شبنم کو کبھی اولاد کی خواہش نہیں رہی۔ حنا کے معاملے میں اسے نا تجربہ کاری کے باعث خاصی تاخیر سے علم ہوا تھا۔ مجبوراً اس نے حنا کو جنم دیا اور اس کے بعد واشگاف الفاظ میں مجھ سے کہہ دیا۔

”جما نگیر اب مجھ سے مزید بچوں کی توقع مت رکھنا۔ میں عورت ہوں کوئی بھیڑ بکری نہیں۔“

جب تک والد و والدہ زندہ رہے، وہ اپنی تمام تر آزاد خیالی کے باوجود ایک حد سے آگے نہیں بڑھی مگر ان کے بعد اسے جیسے آزادی مل گئی۔ اس نے اپنے باپ سے کہہ کر ایک کار لے لی اور سارا دن گھر سے غائب رہنے لگی۔ حنا ملازمہ کی ذمہ داری پر پلنے لگی اور گھر کا نظام درہم برہم ہو گیا۔ جب گھر کی مالکین کو اس کی پروا نہیں تھی تو پھر دوسرا کیوں پروا کرنے لگا مگر اس سے پہلے کہ میرا بیانا صبر لبریز ہوتا۔ قدرت نے خود شبنم کو گھر واپسی پر مجبور کر دیا۔ اس کے باپ اشفاق خان پر خاصے عرصے سے ٹھکانہ کارروائی کا دباؤ تھا اور وہ اپنے اثر رسوخ کے بل پر بچنے میں کامیاب رہا مگر بکرے کی ماں کب تک خیر مناتی تھیں اس کے مخالفوں کی کمی نہیں تھی۔ ان کی کوششوں یا سازشوں سے اپنی کرپشن والوں نے اشفاق خان کو عین اس وقت چھاپا مار کر گرفتار کر لیا۔ جب وہ اتر پورٹ پر ایک کھپسی سے ٹکڑا کھانے میں مصروف تھا۔ اگلے روز ہی اس کی تصویر تمام اخبارات میں موجود تھی۔ اس پر مقدمہ چلا۔ روپیہ بانی کی طرح بہایا۔ حرام کی کمائی جیسے آئی تھی ویسے ہی چلی بھی گئی مگر اشفاق خان نہیں بچ سکا۔ اسے نہ صرف سزا ہوئی بلکہ اس کی جائیداد اور بینک اکاؤنٹس بھی حکومت نے ضبط کر لیے۔ اس میں وہ کار بھی تھی جو شبنم کے زیر استعمال تھی۔ شبنم ایک بار پھر چراغ خانہ بننے پر مجبور ہو گئی کیونکہ سچ محفل بننے پر خاصا خرچ آتا

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

حجۃ شاہدین کیلکولر

ڈاکٹر مصطفیٰ شاکر • ڈاکٹر نرگس معین

قطیفیل بٹون جماعتہ البیلاک

2006ء مکمل ارباب طلاق و طلاق سال 1428ھ کی

افاق ملاقات: صبح 11 رقا 2 بجے

گشت اقبال پور

6/ سفاری ویو بلاک 7 نزد مین گیٹ سفاہی پارک گلشن اقبال کراچی

افاق ملاقات: شام 7 تا 9 بجے رات

شاہدین کیلکولر

مزید معلومات کیلئے فون: 4966698

OCTOBER.99 O JASOOSI O 288

”ناشتا لاؤ۔ مجھے کسی کو قتل کرنے جانا ہے۔“
اس پر شبہم کچن سے ہاتھ صاف کرتے ہوئے برآمد ہوئی
”اگر قتل کرنا ہے تو مجھے ہی کردو۔ اس جہنم سے تو نجات
ملے۔“

میرا موڈ خراب تر ہو گیا ”یہ گھر تمہارے لیے جہنم ہے۔
جہاں تمہارا محبوب شوہر اور ایک عدد پیاری سی بیٹی ہے۔
خواتین کے لیے ایسا گھر جنت ہوتا ہے۔“
مڈل کلاس عورتوں کے لیے۔“ وہ تلخی سے بولی ”لیکن
اب میرا اس دڑبے میں دم گھٹنے لگا ہے اور سنو میں تمہاری
اور تمہاری بچی کی خادمہ نہیں ہوں کہ چوبیس گھنٹے خدمتوں
میں لگی رہوں۔“

معاً مجھے احساس ہوا کہ حنا نے رات بھر اسے جگایا تھا۔
اس کے پیٹ میں درد تھا۔ میں اتنی گہری نیند سوتا تھا کہ مجھے
پتا ہی نہیں چلا۔ البتہ وہ ساری رات حنا کے ساتھ جاگتی
رہی۔ جواب سکون سے سو رہی تھی ”سوری جان۔“ میں نے
ندامت سے کہا۔

”تمہاری ندامت سے مجھے کیا فائدہ ہوگا۔ جو میں چاہتی
ہوں وہ تم مجھے زندگی بھر نہیں دے سکو گے۔“
میں نے بمشکل اپنے غصے پر قابو پایا۔ میں صبح اپنا موڈ
مزید خراب نہیں کرنا چاہتا تھا۔ میں نے نرمی سے کہا ”مجھے
ناشتا دو اور تم آرام کرلو۔ میں آج چھٹی کر رہا ہوں۔ باقی کام
میں دیکھ لوں گا۔“

ناشتے سے فارغ ہو کر میں عرفان کی طرف جانے کا سوچ
رہا تھا کہ وہ خود ہی میری طرف آگیا۔ میں نے اس کی گردن
دبوچی۔

”عرفان، سڑک کے نیچے۔ میں نے صرف ایک اسکرپٹ
لکھا تھا۔ اس پر قلم کیسے بن گئی۔“
اس نے اپنی گردن آزاد کرائی ”تو تجھے بھی معلوم
ہو گیا۔ میں اس وجہ سے تیرے پاس آیا ہوں۔“

میں اسے کھینچ کر ڈرائنگ روم میں لے گیا۔ میں نہیں
چاہتا تھا کہ ہماری باتوں کی بھنک شبہم کے کانوں میں پڑے۔
”دیکھ عرفی، یہ جرم ہے۔ اس میں ہم دونوں برابر کے
شریک ہیں۔ میں نے یہ لعنتی منصوبہ بنایا تھا اور تو نے اسے
ڈاکوؤں تک پہنچایا۔ کیوں؟“

”اس کے لیے۔“ اچانک عرفان نے اپنی جیب سے
سرمئی نوٹوں کی ایک گڈی نکال کر میرے سامنے ڈال دی ”یہ
پورے دو لاکھ ہیں۔ تیرا حصہ۔“
”میرا حصہ!“ میں بھونچکا رہ گیا ”عرفان کینے، وہ صرف

میں مطمئن تھا کہ میرے پاس اتنی معلومات آگئی ہیں۔ جن کی
بنیاد پر میں ایک قابل عمل منصوبہ بنا سکتا تھا۔ مزید ایک ہفتے
بعد میں نے عرفان کو اسی رستوران میں ملنے کو کہا تو میرے
پاس ایک دھماکا خیز پلان تیار تھا۔ رستوران میں اشیائے
خور و نوش صاف کرتے ہوئے جب میں نے عرفان کو اس کی
تفصیلات بتائیں تو اس کی آنکھیں کھلی رہ گئیں۔
”جہانگیر، خبیث، تو جرائم کی دنیا کا جینیٹس ہے۔ ایسا
لاجواب منصوبہ اور کتنا سادہ مگر تو نے اسے بنایا کیسے؟“
”دس فی صد محنت، دس فی صد معلومات اور اسی فی صد
عقل۔ بس منصوبہ تیار۔“ میں نے انکساری سے کہا۔
”کاش کہ ہم اس منصوبے پر عمل کر سکتے۔“ اس نے
سر آہ بھری۔

”بلکہ اس مت کر۔۔۔ ہم مجرم نہیں ہیں۔ یاد رکھ ہم نے
صرف تفریحاً یہ سب کچھ کیا ہے۔ بھول کر بھی کسی سے اس کا
ذکر مت کرنا۔ میں ایسے کاموں اور ایسی کمائی پر لعنت بھیجتا
ہوں۔“

مگر اس کے ٹھیک ایک ہفتے بعد میں نے صبح کا اخبار
دیکھا تو میرے منہ سے صرف لعنت ہی نہیں بلکہ متعدد انواع و
اقسام کی گالیاں برآمد ہوئیں۔ اخبار کے مطابق کل سہ پہر
منی چیئرمین مارکیٹ میں ڈاکا پڑا اور ڈاکو تقریباً ایک کروڑ بیس
لاکھ روپے مالیت کی کرسی لوٹ کر لے گئے۔ ڈاکوؤں کی تعداد
نامعلوم تھی۔ انہوں نے مارکیٹ میں خود بخود پھٹنے والے گیس
بم استعمال کیے۔ جس سے وہاں موجود افراد کی اکثریت بے
ہوش ہو گئی۔ بچے چھپے گاؤں بھی گہرے دھوئیں کے باعث کسی
کارروائی کے قابل نہیں رہے تھے۔ اسی طرح گلی کے باہر
موجود گاؤں اور پولیس والے اندر آنے سے قاصر تھے۔
البتہ انہوں نے فوری طور پر گلی کی ناکا بندی کر دی تھی۔ دس
منٹ بعد جب دھواں چھٹا تو معلوم ہوا کہ ڈاکو کرسی لے کر
فرار ہو چکے ہیں۔ بعد ازاں پولیس نے گلی کے سرے پر ایک
متروک مین ہول کا سراغ لگالیا۔ جو کچھ دور جا کر ایک متروکہ
گٹر لائن سے مل جاتا تھا۔ خیال ہے کہ ڈاکو اسی راستے سے
فرار ہوئے تھے۔ یہ پورا منصوبہ وہی تھا جو میں نے عرفان کے
چیلنج کرنے پر بنایا تھا۔ ڈاکوؤں نے کسی فرماں بردار اولاد کی
طرح اس کے ایک ایک حصے پر عمل کیا تھا۔ حتیٰ کہ واردات
کا وقت وہی تھا جو میں نے تجویز کیا تھا۔ گالیوں کا ذخیرہ ختم
ہو جانے کے بعد میں نے چیخ کر شبہم کو آواز دی۔
”کیا ہے۔“ اس نے کچن سے چلا کر کہا ”یہ صبح
ہنگامہ کس بات پر۔“

”یہ کامیابی کا انعام ہے۔ آئندہ سائٹ ہم بتائیں گے اور پلاننگ تم کرو گے۔ فقط۔۔۔“

اس کے آگے کچھ نہیں تھا لیکن چشم تصور سے میں ان لوگوں کا اندازہ لگا سکتا تھا۔ جو لوگ اتنی صفائی سے ایک مشکل کام کر سکتے ہیں۔ ان کی طاقت اور قوت کا اندازہ لگانا مشکل نہیں تھا۔ تحریر کا انداز حکمیت تھا۔ گویا مجھے ہر صورت ان کے لیے کام کرنا تھا۔ میرا طیش ایک بار پھر بڑھنے لگا اور میں کمرے میں چکراتے ہوئے ان نامعلوم ڈاکوؤں کے خاندانی تجربے کو آپس میں غلط ملط کرنے لگا۔

”میں ان کی ایسی کم تہی کردوں گا۔“ میں نے اعلان کرنے کے انداز میں کہا۔

”کیسے۔ تم انہیں جانتے ہی نہیں ہو۔“

”میں ان کے لیے کام کرنے سے انکار کردوں گا۔“

”میرا خیال ہے۔ تم انکار کی پوزیشن میں نہیں ہو۔“

عرفان نے خشک لہجے میں کہا۔

”وہ مجھے مجبور نہیں کر سکتے۔ میں لعنت بھیجتا ہوں ایسی

رقم پر۔“ میں نے نوٹوں کی گڈی اٹھا کر زمین پر دے ماری۔

”بات رقم کی نہیں ہے۔ مسئلہ یہ ہے کہ اس قسم کے

لوگ انکار سننے کے عادی نہیں ہوتے اور اپنا مطلب حاصل

کرنے کے لیے ہر حربہ استعمال کر گزرتے ہیں۔ انہیں لوگوں

کی مجبوریوں سے کھیلنا آتا ہے۔ تو ان کے لیے اب سونے کا

انڈادینے والی مرغی ہے۔ تو نے ایک ہی واردات میں انہیں

کروڑوں روپے کا فائدہ پہنچا دیا ہے۔ اب وہ تجھے ہرگز نہیں

چھوڑیں گے۔“

”کیا کر لیں گے وہ۔“ میں مشتعل ہو کر بولا ”مجھے مار

ڈالیں گے۔“

عرفان مسکرایا ”بے وقوف، سونے کا انڈادینے والی

مرغی کون ذبح کرتا ہے پھر جو شخص دولت کے لالچ میں نہیں

آتا وہ جان کی پروا بھی نہیں کرتا ہے۔ یہ بات وہ بھی سمجھتے ہیں

مگر فرض کربات تیرے گھروالوں تک آجائے تو کیا تب بھی تو

انکار پر قائم رہ سکے گا۔“

”نکو اس بند کر سٹور کے بچے۔“ میں نے اس کی گردن

دبوچنے کی ایک اور کوشش کی جو اس نے ہوشیاری سے ناکام

بنادی ”مجھے لگتا ہے تو بھی ان کے ساتھ ملا ہوا ہے۔“

”دیکھ ہوش میں آ۔“ میں نے صرف امکان ظاہر کیا تھا۔

وہ بولا۔

”اب تو نے کوئی ایسا دیا امکان ظاہر کیا تو تیرے مقتول

ہونے کے امکانات روشن ہو جائیں گے۔“

ایک مذاق تھا۔ صرف شغل۔۔۔“

”لیکن اب یہ ایک حقیقت بن چکا ہے۔ جیسے تیرا اور

میرا وجود ایک حقیقت ہے۔“

”لعنت ہو اس حقیقت پر۔“ میں چلایا ”مجھے نہیں

چاہیے ایسی دولت۔ میں پولیس کے پاس جا رہا ہوں۔“

”اور اس کے بعد۔ کیا تو بچ جائے گا؟“ عرفان نے سرد

لہجے میں کہا۔

”تو۔ تو مجھے دھمکی دے رہا ہے۔“ میں طیش کے مارے

کانپنے لگا۔

”میں حقیقت بیان کر رہا ہوں۔ سب سے پہلے تو پولیس

تجھے اندر کر دے گی اور پھر تجھ سے ان ڈاکوؤں کے نام پتے

پوچھے جائیں گے۔ جو تو انہیں مر کر بھی نہیں بتا سکے گا۔ تو

جانتا ہی نہیں ہے لیکن پولیس والے تیرا اعتبار نہیں کریں

گے اور وہی کریں گے۔ جو مشین گنے کے ساتھ کرتی ہے۔ وہ

تجھے نچوڑ کر رکھ دیں گے۔“

”تو بچ جائے گا کیا؟“ میں نے زہریلے انداز میں کہا۔

وہ سکون سے بولا ”ٹھیک ہے میں بھی پکڑا جاؤں گا لیکن

جانتا میں بھی کچھ نہیں ہوں۔ وہ جو بھی ہیں، انہوں نے

رستوران میں ہماری باتیں سنی تھیں۔ انہوں نے میرا پیچھا

کیا اور بعد میں فون پر مجھے پیشکش کی کہ اگر میں انہیں

مکمل منصوبہ فراہم کردوں تو وہ مجھے چار لاکھ دیں گے۔ پہلے

میں نے انکار کرنے کا فیصلہ کیا لیکن پھر یہ سوچ کر رضامند

ہو گیا کہ اس طرح تیرا منصوبہ بھی آزمائش کے مرحلے سے

گزر جائے گا۔“

”بے وقوف کسی اور کو بنانا۔“ میرا لہجہ تلخ ہو گیا۔

”درحقیقت تو لالچ میں آگیا تھا۔ کتے کی طرح جو ہڈی کے لالچ

میں آتا ہے۔“

”شاید۔“ اس نے اعتراف جرم کیا ”مگر لالچ سے زیادہ

مجھے خوف نے راضی کیا تھا۔ مجھے ایسا لگا کہ اگر میں نے انکار

کیا تو وہ اس منصوبے کے لیے کسی حد تک بھی جاسکتے ہیں اور

میں کسی پریشانی میں جانے کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ تو جانتا ہے

میں اپنے گھر کا واحد کفیل ہوں۔ ماں باپ، بھائی اور دو شادی

کے قابل بہنوں کا بوجھ مجھ پر ہی ہے۔ اگر مجھے کچھ ہو گیا تو

میرے گھر کا شیرازہ بکھر جائے گا۔“

”تو میرے جذبات سے کھیلنے کی کوشش کر رہا ہے۔“

”شاید تجھے یقین نہیں آیا۔“ وہ افسردہ ہو گیا ”یہ دیکھ صبح

رقم کے ساتھ مجھے گھر کے دروازے سے یہ پرچہ بھی ملا تھا۔“

اس نے جیب سے ایک کاغذ نکال کر دیا۔ اس پر لکھا تھا

”کچھ بھی کہہ دے، تجھے کرنا وہی پڑے گا۔ جو وہ چاہیں گے۔“ اس نے بے پروائی سے کہا۔
وہ رخصت ہونے لگا تو میں نے اسے نوٹوں کی گڈی تھما دی ”اسے لے کر دفع ہو۔“
”اس سے میرا کوئی تعلق نہیں ہے۔“ اس نے بے رخی سے گڈی واپس پھینک دی۔

اس کے جاتے ہی شبنم آگئی۔ مجھے گڈی چھپانے کا موقع ہی نہیں ملا مگر اس کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ اس نے ہماری باتیں سن لی تھیں۔

”اوہ میرے خدا! اتنے سے کام کے دو لاکھ روپے۔“ اس نے پرجوش انداز میں کہا ”جہاں گیر تم نے فوراً ہاں ٹیوں نہیں کر دی۔“

میں نے اس کے ہاتھ سے گڈی چھین لی ”یہ حرام کا مال ہے۔ نہ میں حرام کام کر سکتا ہوں اور نہ اپنی اولاد کو حرام کھلا سکتا ہوں۔“

”تم صرف ہمیں ترسا سکتے ہو۔“ اس نے تلخی سے کہا ”مجھے یقین نہیں آتا کہ آج کے دور میں کوئی شخص اتنی قدامت پرست ذہنیت کا مالک ہو سکتا ہے۔ دیکھو جہاں گیر تمہیں خدا نے موقع دیا۔۔۔“

”خدا کا نام درمیان میں مت لاؤ۔“ میں نے اس کی بات کاٹی ”مجھے حیرت ہے کہ لوگ اس قدر منافق ہو گئے ہیں کہ گناہ بھی خدا کا نام لے کر اور اس کی مدد مانگ کر کرتے ہیں۔“
”تو تم انکار کر دو گے۔“ اس کا موڈ خراب نظر آنے لگا۔

”میرے سامنے تمہارے والد کی مثال ہے۔ بودرخت حرام۔ انہوں نے زندگی بھر جو کمایا تھا۔ وہ جمع سود کے واپس چلا گیا۔ بدنامی مفت میں مل گئی۔ آج تمہارے بھائی کسی کے سامنے سر اٹھا کر بات کرنے کے قابل نہیں رہ گئے ہیں۔“
میرا لہجہ طنزیہ ہو گیا۔

”جہاں گیر تمہارا مرض ایمانداری ناقابل علاج ہو چکا ہے۔“ اس نے کہا اور تنہائی ہوئی وہاں سے چلی گئی۔

میں نے نوٹ احتیاط سے الماری کے لاکر میں رکھ دیئے۔ اب مجھے انتظار تھا کہ ڈاکو کب مجھ سے رابطہ کریں تو میں انکار کے ساتھ یہ گڈی بھی ان کے منہ پر ماروں مگر کئی روز کے انتظار کے بعد بھی ان کا فون نہیں آیا۔ البتہ ایک روز صبح جب ہم سو کر اٹھے تو سارا گھر الٹا پڑا تھا اور کئی قیمتی اشیاء غائب تھیں۔ جس میں نوٹوں کی گڈی بھی شامل تھی۔

فیروپائرین (رجسٹرڈ)

قائم شدہ 1956

T.M. Reg. 7635

فیروپائرین
فیروپائرین
فیروپائرین
فیروپائرین
فیروپائرین
فیروپائرین
فیروپائرین
فیروپائرین
فیروپائرین
فیروپائرین

دانتوں میں لگے ہوئے سب کیرنوں کو جڑ سے بالکل ختم کر دیتی ہے۔
دانتوں اور مسوڑوں میں ٹھنڈا اور گرم پانی لگنا بند کر دیتی ہے۔
پائوریائی کی خطرناک بیماری دور کر کے دانتوں اور مسوڑوں کو تندرست رکھتی ہے۔
مسوڑوں سے گندہ اور بادی پانی خارج کر کے درم اور سوزش اتارتا ہے۔
مسوڑوں سے خون نکلنا بند کر کے مسوڑوں کو مضبوط اور سخت بناتی ہے۔
منہ کے ان تمام جراثیم کو ہلاک کرتی ہے جو دانتوں میں کیرنا بنانے کا سبب بنتے ہیں۔
منہ میں گندگی اور بدبو دور کر کے سانسوں کو خوشگوار بناتی ہے۔
دانتوں مسوڑوں اور منہ کی سبب پیچیدہ بیماریوں کی بے مثال دوائی ہے۔
جراثیم کش ہے زخموں پر لگائی جاسکتی ہے۔

Packing

10 ml Rs. 12.00.

25 ml Rs. 24.00

ہر اچھے گھر کی ضرورت

فیر لیبلڈ ٹریڈ O/1084، غازی روڈ، راولپنڈی۔ فون (051-451631)

تیار کردہ

ایک بہترین منصوبہ ساز ہو... پھر تم اپنی صلاحیت سے فائدہ کیوں نہیں اٹھاتے۔

”اس لیے کہ میں اسے صلاحیت نہیں سمجھتا اور اگر یہ صلاحیت ہے بھی تو مجھے اسے اندازہ جرائم پر صرف کرنا چاہیے نہ کہ مجرمانہ منصوبے بنانے پر اور تم نے سائنس دانوں کا حوالہ دیا ہے تو وہ صرف ہتھیار ہی نہیں بناتے بلکہ انہوں نے انسانیت کے لیے بہت ساری آسانیاں بھی ایجاد کی ہیں۔ یہ اپنی اپنی فطرت کی بات ہے۔ کوئی گلشن تعمیر کرتا ہے، کوئی اسے اجاڑنے کے درپے ہو جاتا ہے۔ اگر مجھ میں کوئی صلاحیت ہے بھی تو میں اپنے مزاج کے مطابق اسے تعمیری انداز میں ہی استعمال کروں گا۔“

”یہ سب کتابی باتیں ہیں نوجوان۔“ اس کا لہجہ مزید نرم ہو گیا ”آج کل سب سے بڑی حقیقت پیسہ ہے۔ جس کے پاس پیسہ ہے وہ سب کچھ ہے اور جس کے پاس پیسہ نہیں ہے۔ اسے لوگ صرف راستے کا پتھر سمجھتے ہیں۔ میرے خیال میں تم سے زیادہ تمہاری بیوی سمجھ دار ہے۔“

”شبث تم اسے کیسے جانتے ہو؟“ میں نے برہمی سے کہا۔

وہ ہنسا ”ہم جس سے کام لیتے ہیں۔ اس کی سات پشتوں کو جان لیتے ہیں۔ تم اگر چاہو تو معاوضے میں اضافہ بھی ہو سکتا ہے۔ مقررہ رقم کے علاوہ ہر مشن میں کامیابی کے بعد حاصل ہونے والی رقم کا مخصوص حصہ تمہیں دیا جائے گا۔“

”میں انکار کر چکا۔۔۔“

”آں ہاں، فیصلہ جلد بازی میں نہ کرو۔ تمہارے پاس سوچنے کے لیے دو دن ہیں۔ اچھی طرح سوچو، صرف انکار مت کرو۔ اس کے نتائج پر بھی غور کرتے رہو کیونکہ مجھے دنیا میں اگر کسی چیز سے چڑ ہے تو وہ یہی لفظ ”انکار“ ہے۔ میں کسی صورت اسے برداشت نہیں کر سکتا۔“ اس کے لہجے میں یک لخت سفاکی در آئی تھی۔ اس سے پہلے میں کچھ کتا اس نے فون بند کر دیا۔ میں اس کی بات میں تھپھی دھمکی بخولی سمجھ رہا تھا۔ میرا دل انجانے خدشات سے لرز رہا تھا۔ اس کے باوجود جب دو دن بعد اس کا فون آیا تو میں نے انکار کر دیا۔

”تم سے جو ہو سکتا ہے کرلو۔“ میں نے چلا کر کہا تھا ”میں ہر گز تمہارے ساتھ شامل نہیں ہوں گا۔“

مجھے احساس تھا کہ میں نے اندھیرے میں ایک ناگ کی دم پر پیر رکھ دیا تھا اور اب وہ انجانے میں مجھ پر وار کرنے کو تیار تھا۔ میری غافیت اسی میں تھی کہ کچھ عرصے کے لیے منظر عام سے ہٹ جاؤں۔ میں نے شبث کو تیار ہونے کی ہدایت کی

شبثم کے زیورات کے دو سیٹ غائب تھے مگر نہ جانے کیوں مجھے اس کا رونادھونا اور وادیا کرنا مصنوعی لگا۔ اول تو اس کے جو سیٹ غائب ہوئے تھے، وہ معمولی نوعیت کے تھے۔ اس کے بھاری اور قیمتی سیٹ بینک لا کر میں تھے۔ اسی طرح میرے پاس تقریباً پچاس ہزار کے پرائز بونڈز پڑے تھے۔ وہ بھی لا کر میں تھے گویا غائب ہونے والی واحد اہم چیز دو لاکھ روپے تھے۔ سب سے زیادہ حیرت مجھے اس بات پر تھی کہ میری آنکھ کیوں نہیں کھلی۔ چوری کرنے والا اطمینان سے میرے بیڈ روم کی چیزیں کھنگالتا رہا اور میں سویا رہا۔ میں پھر بھی گہری نیند سوتا تھا۔ جبکہ شبثم کچی نیند سوتی تھی۔ اسے بھی کچھ نہیں پتا چلا۔

”پولیس میں رپورٹ درج کرانی ہوگی۔“ میں نے کہا۔

”پولیس میں! شبثم ایک لمحے کو گھبرائی ”مگر پولیس کیا کرے گی۔ الٹا ہمیں تنگ کرے گی اور چائے پانی کی رقم مانگے گی۔ روزانہ تفتیش کے بہانے ہمارے سر پر سوار رہا کرے گی۔“

”مگر وہ دو لاکھ روپے ملنا ضروری ہیں شبثم۔ وہ میرے پاس امانت تھے اور اگر میں واپس نہیں کر سکا تو ان کی بات ماننے پر مجبور ہو جاؤں گا اور میں یہ کام نہیں کر سکتا۔“

”میں تو کہتی ہوں کہ اس موقع سے فائدہ اٹھا کر۔“

اس نے وہی پرانا رگ الاپا۔

میں نے غور کیا تو مجھے بھی پولیس میں رپورٹ کرانا درست نہیں لگا۔ اول تو انہوں نے کچھ کرنا نہیں تھا۔ اس کے بجائے وہ اس چکر میں پڑ جاتے کہ میرے پاس دو لاکھ روپے کہاں سے آئے۔ اس کے اگلے ہی دن فون آگیا۔

”مجھے امید ہے تم ہمارے لیے کام کرنے کو تیار ہو گئے ہو گے۔“ دوسری طرف سے کسی نے بھاری آواز میں کہا۔ نہ جانے مجھے یہ لگا جیسے اردو بولنے والے کی مادری زبان نہ ہو۔ اس میں کسی قدر غیر ملکی رنگ تھا۔

”مجھے افسوس ہے کہ میں تمہاری پیشکش مسترد کر رہا ہوں۔“ میں نے محتاط انداز میں کہا ”پہلی دفعہ جو ہوا وہ ایک اتفاقی واقعہ تھا۔ جس کا تم لوگوں نے فائدہ اٹھایا۔ ہمارے لیے یہ صرف ایک شغل تھا اور تم نے اس پر عمل کر ڈالا۔ بہر حال میرا ضمیر اس معاملے میں صاف ہے۔“

”تم شاید جذباتی ہو رہے ہو۔ ذرا غور کرو۔ ہر شخص کو قدرت کوئی نہ کوئی صلاحیت دیتی ہے۔ کوئی مصور بنتا ہے، کوئی موسیقار، کوئی سائنس داں بنتا ہے اور انسانیت کش ہتھیار ایجاد کرتا ہے۔ تم کو بھی ایک صلاحیت ملی ہے۔ تم

نہیں ہو۔ لگتا ہے تمہیں اپنی اکلوتی بیٹی سے زیادہ پیار نہیں ہے لیکن شوبی نے اسے بہت پسند کیا ہے۔“ آخری جملہ کہتے ہوئے اس کا لہجہ سفاک ہو گیا تھا۔

میں چونک اٹھا۔ اس نے دوسری بار کسی شوبی کا حوالہ دیا تھا ”یہ شوبی کون ہے؟“

”شوبی کون ہے۔“ وہ ہنسا ”ایسا کرو اپنی بیٹی سے پوچھ لو۔“

اگلے لمحے حنا لائن پر تھی۔ وہ رو رہی تھی اور بار بار ایک ہی بات دہرا رہی تھی ”پاپا مجھے ڈر لگ رہا ہے۔ یہاں بہت بڑا کتا ہے۔ پاپا مجھے ڈر لگ رہا ہے۔ مجھے آکر لے جائیں۔“

اس کے الفاظ تیرہن کر میرے دل پر لگ رہے تھے ”میں آ رہا ہوں پاپا کی جان۔“ میری آواز بھرا گئی۔

”سن لیا تم نے۔“ وہ پھر لائن پر تھا ”ویسے اس ننھی بچی نے شوبی کی توہین کی ہے۔ خیر تو پھر تم کیا کہتے ہو۔“

”میں تیار ہوں۔ میں تمہارے لیے وہ سب کروں گا جو تم کہو گے مگر میری بیٹی واپس کر دو۔“ میں نے گلوگیر لہجے میں کہا۔

”گڈ۔“ وہ ہنسا اور فون بند کر دیا۔ میں ہیلو چلا تا رہ گیا۔ اس قسم کے سرد مزاج لوگ بے حد سفاک بھی ہوتے

ہیں۔ یہ کسی کو ہنستے کھیلنے موت کے گھاٹ اتار کر دوبارہ اپنے مشغلے میں مصروف ہو جاتے ہیں۔ اگرچہ میں نے ہتھیار ڈال دیئے تھے، مگر میں ابھی بھی حنا کی سلامتی کے لیے فکر مند تھا۔

البتہ شبنم کے چہرے پر اطمینان کے تاثرات تھے۔ میں نے اس وقت سکون کا سانس لیا۔ جب دروازے پر ہلکی سی دستک ہوئی۔ ہم دونوں ایک ایک ساتھ باہر دوڑے، باہر حنا کھڑی تھی اور گلی کے کونے پر ایک کار مڑ رہی تھی۔ میں نے بے

تابی سے حنا کو بانہوں میں بھر لیا۔

”پاپا، مجھے نیند آرہی ہے۔“ اس نے منہ بسورتے ہوئے کہا اور میرے کندھے پر سر رکھتے ہی سو گئی۔

تین دن بعد مجھے ایک لفافہ موصول ہوا تھا۔ جس میں شہر کی ایک مصروف جوہری مارکیٹ کے بارے میں تفصیلات تھیں۔ یہ میرا پہلا اسائنمنٹ تھا۔ بیٹی کی محبت نے مجھے مجرموں کے ہاتھوں کھیلنے پر مجبور کر دیا تھا۔ میں نے مارکیٹ کا جائزہ لے کر ایک منصوبہ بنایا اور ڈاکوؤں نے اس پر کامیابی سے عمل کرتے ہوئے وہاں سے تقریباً ساٹھ لاکھ روپے مالیت کے جواہرات اور زیورات اڑا لیے پھر ایک کے بعد ایک ”مشن“ مجھے ملتا رہا تھا اور میں نت نئے منصوبے بناتا رہا تھا۔

اور خود ایک دوست کے پاس روانہ ہو گیا۔ جس کے پاس سمندری ہٹ تھا۔ میں کچھ روز اسی ہٹ میں گزارنا چاہتا تھا مگر جب میں واپس لوٹا تو شبنم مجھے زار و قطار روتی ملی۔ مجھے دیکھ کر وہ چیخی۔

”جہانگیر! حنا غائب ہے۔“

”کیسے؟“ میں نے ڈوبتے دل سے کہا۔

”بتا نہیں میں سامان سیٹ کر رہی تھی کہ وہ چپکے سے باہر نکل گئی۔ کچھ دیر بعد مجھے خیال آیا تو میں نے باہر نکل کر دیکھا تو وہ کہیں نہیں تھی۔ بڑوسیوں سے بھی معلوم کروایا۔ حنا کسی کے گھر نہیں ہے، جہانگیر میری بچی۔۔۔“

”اب تمہیں خیال آ رہا ہے۔“ میں نے تلخی سے کہا اور باہر نکل گیا۔

اگرچہ مجھے سو فی صد یقین تھا کہ یہ ان ہی لوگوں کی کارستانی تھی جو مجھ پر دباؤ ڈال رہے تھے۔ اس کے باوجود میں نے حنا کو علاقے میں تلاش کیا۔ گلی محلے چھانے، مسجد میں اعلان کروایا مگر اسے نہ ملنا تھا نہ ملی۔ کچھ لوگوں نے پولیس میں رپورٹ کرانے کا مشورہ دیا۔ جسے میں نے اغوا برائے

تاوان کا بہانہ بنا کر مسترد کر دیا۔ اب مجھے ان لوگوں کے فون کا انتظار تھا۔ خدا خدا کر کے فون کی کھنٹی بجی تو میں نے لپک کر فون اٹھالیا۔

”بہت جلدی ہے۔“ اس بھاری آواز نے ہنس کر کہا۔

”سنو میری بچی کا بال بھی بکا ہوا تو میں تم سب کو قتل کر دوں گا۔“ میں نے دانت پیس کر کہا۔ غصے کے مارے آواز اور میں خود لرز رہا تھا۔

”ارے نہیں۔ بچوں سے تو میں خود بھی بہت پیار کرتا ہوں اور میرا شوبی بھی انہیں پسند کرتا ہے۔ تمہاری بیٹی تو بہت پیاری ہے بالکل گڑیا جیسی۔ اسے میں نقصان پہنچانے کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔“

”تو پھر تم نے میری بیٹی کو کیوں اغوا کیا؟“ میں دھاڑا۔

میں سمجھ رہا تھا کہ وہ میرا مذاق اڑا رہا ہے۔ ہر یا اختیار شخص کی طرح وہ بھی اختیار کے نشے میں چور تھا۔

”بعض اوقات گھی سیدھی انگلیوں سے نہیں نکلتا تو انگلیوں کو ٹیڑھا کرنا پڑتا ہے۔ تم سمجھ رہے ہو نا۔۔۔“

”یعنی تم چاہتے ہو کہ میں تمہارے گروہ میں شامل ہو کر وارداتیں کروں۔“

”یہ کس نے کہا۔“ وہ فون پر بے حد محتاط تھا ”میں تو صرف یہ چاہتا ہوں کہ تم میرے کام آؤ اور میں تمہارے کام آؤں لیکن تم اتنی ذرا سی بات سمجھنے اور ماننے کے لیے تیار

نے میرا جو حشر کیا۔ اس کی تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں ہے۔ ماشاء اللہ ہمارے قارئین باخبر ہیں اور جانتے ہیں کہ پولیس جب کسی کی زبان کھلوانے پر مل جائے تو وہ پیدا کی گونگی اور ایک محاورے کے مطابق پتھر کی زبان بھی کھلوا سکتی ہے۔ میں نے ان تمام جرائم کا اعتراف کر لیا۔ جو تین سال کی عمر سے میری یادداشت میں محفوظ تھے۔ ان میں کتے کو پتھر مارنے سے لے کر ساتویں جماعت کی لڑکی کو سیٹی مارنے تک کے جرائم شامل تھے۔ پولیس والے اعترافات سن کر ہنستے تھے۔

”الو کے پٹھے، ہم اس قسم کے اعترافات نہیں سننا چاہتے۔“ حوالدار نے میری تشریف پر تیرہ نمبر کا لٹر آزمایا۔ ”پھر آپ کیا سننا چاہتے ہیں؟“ میں نے تڑپ کر کہا۔ ”اوہ بچو جی، کوئی قتل، شہل، کوئی ڈاکا شاکا، کوئی ریپ شیپ۔“ حوالدار کے سامنے لقمہ دیا ”بچو جی، ہمیں اس قسم کے جرائم سے دلچسپی ہے۔“

”پاگل کا پتر۔“ تیسرے نے ایک عدد آسبی تھپتھپے کے ساتھ کہا ”پتھر مارنے اور آنکھ مارنے کو جرم سمجھتا ہے۔“ دو ہفتے کسی عذاب کی طرح گزرے۔ شاید ابتلا کے دور میں وقت کی رفتار بھی ست پڑ جاتی ہے۔ مجھے ایسا لگا جیسے میں نے دو صدیاں گزار دی ہوں۔ دو ہفتے بعد پولیس نے بغلیں بجاتے ہوئے میرے اعتراف جرم کی طویل فہرست پر چالان کے نام پر عدالت میں پیش کر دی اور میں حسب روایت عدالت میں جا کر مکر گیا۔ میں نے اپنے جسم پر تشدد کے نشانات عدالت کو دکھاتے ہوئے کہا۔

”یور آنرا جو کچھ میں نے بھگتا ہے۔ اگر کسی گینڈے کو بھی برداشت کرنا پڑتا تو وہ ان سے زیادہ جرائم کا اعتراف کر لیتا۔“

اس پر عدالت میں موجود لوگ بلند آواز سے ہنسے۔ تفتیشی افسر نے مجھے کھا جانے والی نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا ”میں عدالت سے مزید ریمانڈ کی درخواست کرتا ہوں۔ پولیس کی تفتیش ابھی مکمل نہیں ہوئی ہے۔“ ”تو پھر آپ نے یہ چالان کیوں پیش کیا ہے۔“ جج نے حیرانی سے کہا۔

اس پر حاضرین پھر ہنسے۔ بہر حال جج نے ریمانڈ کی درخواست مسترد، پھر میری ضمانت کی درخواست بھی مسترد کر دی اور مجھے جیل کسٹڈی پر بھیج دیا۔ اس روز مجھے شہزاد عباس کے دلائل سن کر حیرت ہوئی۔ اس کے دلائل اور انداز کمزور تھا جبکہ میں جانتا تھا وہ بہت اچھا وکیل تھا۔ میں

البتہ میں نے اس کا معاوضہ یہ کہہ کر لینے سے انکار کر دیا تھا کہ یہ جرم میں مجبوراً کر رہا ہوں۔ پیسے کے لیے نہیں، اس پر شبنم مجھ سے خوب ہی بھگڑی تھی۔ ”جب تم محنت کر رہے ہو تو اس کا معاوضہ بھی لو۔“ ”بہتر ہو گا میں خود نہ ڈاکے مارنے لگوں۔“ میں نے تلخی سے کہا تھا۔

مگر پہلی دفعہ کے بعد شبنم نے مجھ سے دوبارہ اس موضوع پر بات نہیں کی تھی۔ میں نے سکون کی سانس لی تھی۔ ان دنوں میں ایک ایسی گاڑی کو لوٹنے کے منصوبے پر کام کر رہا تھا۔ جو بندرگاہ اور اس سے ملحقہ علاقوں میں کام کرنے والے افراد کے لیے تنخواہیں لے کر جاتی تھی۔ ہر مہینے کی پہلی تاریخ کو اس آرمرڈ کار میں تقریباً پچاس لاکھ کیش جاتا تھا۔ میں نے حسب معمول اپنی طرف سے بہترین منصوبہ بنایا (نامعلوم شخص جو خود کو آغا کہتا تھا۔ اس نے مجھے دھمکی دے رکھی تھی۔ اگر کوئی منصوبہ اس لیے ناکام رہا کہ میں نے اس میں جان بوجھ کر کوئی سقم چھوڑ رکھا تھا یا خبری کا شبہ ہوا تو اس کا خمیازہ مجھے ہیوں اور بجی سمیت بھگتنا پڑے گا) مگر اتفاق سے ایک بات سے وہ شخص آغا اور میں ٹیگس طور پر بے خبر تھے کہ آرمرڈ کار کے ساتھ سادہ لباس میں پولیس کمانڈوز بھی پیچھے کسی عام گاڑی میں ہوتے تھے۔ اب ہوا یہ کہ میرے منصوبے کے عین مطابق آغا کے آدمیوں نے آرمرڈ کار روک لی اور اس کے عقبی حصے میں موجود گارڈز کو اشک اور ٹیگس استعمال کر کے باہر آنے پر مجبور کر دیا مگر عین اس وقت جب وہ کیش بکس اٹھالے جا رہے تھے۔ پولیس کمانڈوز نے ان پر بل بول دیا۔ جھ میں سے تین تو فوراً مارے گئے۔ بقیہ تین بھی زخمی ہوئے لیکن ان کی جان بچا لی گئی اور ان کے بیان پر میں مارا گیا۔ ان میں سے ایک نے پولیس کے ایک طرف تفتیش کی تاب نہ لاتے ہوئے بک دیا کہ اس واردات اور اس سے پہلے متعدد وارداتوں کا منصوبہ ساز میں تھا۔

پولیس نے گھر پر چھا پا مار کر مجھے گرفتار کر لیا۔ میرے وکیل شہزاد عباس نے اگلے روز مجھ سے ملاقات کی اور نسلی دی۔

”جہانگیر صاحب، آپ فکر مت کریں۔ آپ کے خلاف الزام بہت کمزور ہے۔ پولیس کے پاس کوئی ثبوت اور گواہ نہیں ہے۔ میں کل ہی آپ کی ضمانت کرا لوں گا۔“ مگر جج اس کے ”دلائل“ سے اتنا متاثر ہوا کہ ضمانت کے بجائے میرا دو ہفتے کا ریمانڈ دے دیا۔ اس کے بعد پولیس

جواب میں گولی مارتے میں وہاں سے فرار ہو گیا۔ ایک ہوٹل میں بیٹھ کر کڑک پتی پیتے ہوئے میں اپنے حالات پر غور کر رہا تھا۔ جن میں مالی حالات سرفہرست تھے۔ میرے پاس گھر نہیں تھا، کوئی بینک بیلنس نہیں تھا۔ میری جیب میں چند سو روپے پڑے تھے۔ میری بیوی مجھے دھوکا دے گئی تھی اور اب میں لاوارث گدھے کی طرح تھا۔

معاذ میر دو افراد آکر بیٹھ گئے۔ ایک کی شکل چوہے جیسی تھی اور اس کی تلوار مارکہ مونچھیں مضحکہ خیز حد تک لمبی تھیں۔ جب کہ دوسرا شکل و صورت اور جسامت کے لحاظ سے ایک افریقی گوریلے سے مشابہ تھا۔

”جہانگیر باؤ، ہم تمہیں لینے آئے ہیں۔“ بن مانس کی آواز خاصی نرم تھی۔

”کیونکہ تم بے گھر اور بے روزگار ہو۔“ چوہے نے مونچھیں ہلا کر کہا۔

”ہم تمہیں گھر اور روزگار فراہم کریں گے۔“ بن مانس بولا۔

غالباً وہ پہلے سے طے کر کے آئے تھے کہ انہیں کیا کمنا ہے اور مجھے لا جواب کرنے کے لیے بن مانس نے ایک عدد پستول بھی رکھا ہوا تھا۔ جو اس کی جیب سے جھانک رہا تھا۔ میں نے ایک عدد گہری سانس لے کر کہا۔

”مجھے کہاں چلنا ہے؟“

”جہاں ہم لے جائیں۔“ چوہے نے پھر مونچھیں ہلائیں۔

میں سمجھ گیا کہ مزاحمت فضول ہے۔ وہ مجھے لے جانے کے لیے کسی آدمی کو مارنا اتنا ہی آسان تھا جتنا کہ میرے لیے مچھر مارنا۔ جیل میں رہ کر مجھے کچھ آیا ہو یا نہ آیا ہو۔ انسانوں کی شناخت کرنا آگئی تھی۔ وہ اپنی حرکات و سکنات سے نہایت ٹھنڈے مزاج کے لگتے تھے۔ جو بغیر اشتعال میں آئے کچھ بھی کر سکتے تھے۔ ہوٹل کے باہر ان کی گاڑی موجود تھی۔ بن مانس پچھلی نشست پر میرے ساتھ بیٹھ گیا اور چوہے نے ڈرائیونگ سنبھال لی۔ اب سوال یہ تھا کہ وہ کون تھے اور مجھے کہاں لے جا رہے تھے اور سب سے اہم بات یہ کہ انہوں نے مجھے تلاش کیسے کیا۔ آج صبح جیل سے رہائی کے بعد میں صرف اپنے گھر کی طرف گیا تھا اور وہاں سے نکل کر کسی شتر بے مہار کی طرح گھوم رہا تھا۔ یہ اتفاق تھا کہ میں انہیں مذکورہ ہوٹل میں مل گیا تھا یا وہ شروع سے میرے پیچھے تھے۔ میں نے مسکرا کر بن مانس سے کہا۔

”میرا خیال ہے اب ہمارا تعارف ہو جانا چاہیے۔ ایسا

وکیل تبدیل کرنے کے بارے میں سوچنے لگا مگر خبثت نے میری مخالفت کی۔

”اس موقع پر وکیل تبدیل کرنے سے کیس پر بڑا اثر پڑے گا۔“

”تو ابھی کون سا اچھا اثر پڑ رہا ہے۔“ میں نے خفگی سے کہا ”مجھ پر لگی دفعات قابل ضمانت ہیں۔ وہ مجھے رہا تک تو کرا نہیں سکا تو جبری کیا کرائے گا۔“

”یہ وہم ہے تمہارا۔ اس کا کمنا ہے کہ وہ جان بوجھ کر اپنے اہم دلائل نہیں دے رہا۔ یہ بعد میں کام آئیں گے۔“ اور میں شہزاد عباس کے کارآمد دلائل کا انتظار ہی کرتا رہ گیا۔ پیشی پر پیشی گزرتی گئی اور ہر دفعہ مجھے ایسا لگتا کہ عدالت میرے خلاف جارہی ہے۔ حتیٰ کہ مجھے تین سال قید کی سزا سنائی گئی۔ اس روز میں سخت مشتعل ہو گیا۔ فیصلہ سن کر شہزاد عباس مجھ سے نظریں ملائے بغیر عدالت سے چلا گیا۔ پولیس دین میں سوار ہونے سے پہلے خبثت نے میری مختصر ملاقات ہوئی۔

”تو یہ تھے اس کے خفیہ دلائل۔“ میں نے تلخی سے کہا ”مجھے ایک ایسے مقدمے میں سزا ہوئی ہے جس میں نہ تو میرے خلاف ثبوت تھا اور نہ کوئی گواہ۔“

”عدالتی معاملات میں کچھ نہیں کہا جاسکتا۔“ وہ اب بھی شہزاد کی حمایت کر رہی تھی ”شہزاد نے اپنی طرف سے پوری کوشش کی تھی۔ ہم اب بھی مایوس نہیں ہوئے ہیں۔ ہم سزا کے خلاف اپیل کریں گے۔“ اس وقت میں نے غور نہیں کیا کہ وہ خود کو شہزاد عباس کے ساتھ شمار کر رہی تھی۔



یہ سب سوچتے ہوئے میں نے ایک میرا تھن ریس کے برابر فیصلہ طے کر لیا تھا اور اگر درمیان میں آنے والی رکاوٹوں کو شمار کیا جائے تو اسے بے آسانی ہرڈلو ثابت کیا جاسکتا تھا۔ بالآخر جب میں ایک گاڑی کے نیچے آتے آتے بچا۔ ڈرائیور نے سر نکال کر کہا۔

”سڑک کے نیچے۔ یہ سڑک تیرے باپ کی نہیں کارپوریشن کی ہے۔“ میں نے جواب آں غزل کے طور پر کہا۔

”یہ سڑک گاڑی چلانے کے لیے ہے۔ اندھے بیلوں کے ٹھلنے کے لیے نہیں۔“ اس نے ایک ناقابل اشاعت گالی کے ساتھ کہا اور گاڑی دوڑادی۔ میرا پھینکا ہوا پتھر ایک بحیرہ جیب پر جا کر لگا۔ جس میں کوئی وڈیرا اپنے محافظوں کے ساتھ جا رہا تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ اتر کر پتھر کے

”مجھے تباہ کر کے کہتا ہے میں جذباتی نہ ہوں۔ آغا میرا بس چلے تو تیرا خون پی جاؤں۔“

”مجھے اعتراف ہے۔ میرے ایک غدار کی وجہ سے تمہیں اتنی تکلیف اٹھانی پڑی مگر اس کو سزا مل چکی ہے۔“

آغا نے ایک اخبار میری طرف بڑھایا جس میں دو کالمی سرخی میں اس قیدی کی پراسرار موت کا ذکر تھا۔ جس نے پولیس کو میرا نام بتایا تھا۔

”اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ میں نے جو تکلیف اٹھانی تھی، وہ اٹھالی۔“

”میں تمہارے سامنے صرف اپنی پوزیشن صاف کرنا چاہ رہا تھا۔“ وہ بولا۔ اس کے اشارے پر گوریلے نے میرے بازو چھوڑ دیے تھے۔

”بیٹھ جاؤ۔“ اس نے سامنے رکھی کرسی کی طرف اشارہ کیا ”تمہارے ساتھ جو کچھ ہوا، مجھے اس پر افسوس ہے۔“

اگر میرا آدمی وہ حماقت نہ کرتا تو تم جیل نہ جاتے اور وہ خود بھی زندہ رہتا۔ بہر حال جو کچھ ہوا میں اس کی تلافی کے لیے تیار ہوں۔“

میں تلخی سے مسکرایا ”تم کیا تلافی کر سکتے ہو۔ کیا تم مجھے میری بیوی دلا سکتے ہو جو دھوکے سے مجھ سے طلاق لے کر فرار ہو گئی۔ وہ گھر واپس لا سکتے ہو۔ جو میرے ماں باپ کی نشانی تھا۔ کیا تم مجھے میری بیوی دلا سکتے ہو۔“

”تمہیں سب مل جائے گا۔“ اس نے پریقین انداز میں کہا ”مجھے معلوم ہے تمہاری بیوی نے تمہارے ساتھ اس وکیل شہزاد عباس کے ساتھ مل کر دھوکا کیا تھا۔ بعد میں دونوں نے شادی کر لی تھی۔“

”شادی نہیں اسے بدکاری کہو۔ میں نے اسے طلاق دی ہی نہیں۔ قانونی لحاظ سے کچھ بھی سہی لیکن شرعی لحاظ سے اسے طلاق نہیں ہوئی وہ اب بھی میری بیوی ہے۔“

”دوسرے دو کام بہت آسان ہیں۔ میں تمہیں تمہارا مکان دلا دوں گا۔ دیگر نقصانات کی تلافی بھی ممکن ہے۔ تم چاہو تو اپنی کمپیوٹر فرم کھول لو۔۔۔“

”اور اس سب کے بدلے مجھے کیا کرنا ہو گا۔“

وہ دھیرے سے ہنسا ”تمہاری ذہانت کا تو میں ہمیشہ سے قائل رہا ہوں۔ تم نے ٹھیک سوچا۔ یہ دنیا کچھ لو، کچھ دو کا نام ہے۔ تمہیں یہ سب کچھ پانے کے لیے میرا ایک کام کرنا پڑے گا۔ ایک آخری کام!“

مجھے یہ اندازہ اسی وقت ہو گیا تھا۔ جب میں نے آغا کی آواز پہچانی تھی۔ میں بظاہر سوچ رہا تھا مگر میری نگاہ آغا کے

نہ ہو کہ تم لوگ غلط فہمی میں غلط بندے کو لے جا رہے ہو۔“ جواب میں بن مانس نے مجھے ایک سیاہ شیشوں والی عینک پہنا دی۔ جو اس قسم کی تھی کہ اسے پہننے کے بعد کچھ بھی دیکھنا ناممکن تھا۔

”ہم تمہیں جہاں لے جا رہے ہیں، وہاں تمہیں تمام سوالوں کے تسلی بخش جوابات مل جائیں گے۔“

میں نے محسوس کیا کہ گاڑی بڑی تیزی سے دائیں بائیں موڑ کاٹ رہی تھی۔ گویا وہ چاہتے تھے کہ میں اندازے سے بھی ان کی منزل کے بارے میں نہ جان سکوں۔ تقریباً ڈیڑھ گھنٹے کے بعد گاڑی رکی۔ ہارن بجا۔ غالباً کوئی بڑا گیٹ کھلا اور گاڑی کچھ دور جانے کے بعد رک گئی۔ اس ڈیڑھ گھنٹے میں وہ مجھے ساٹھ ستر میل دور بھی لے جاسکتے تھے اور گھما پھرا کر وہیں کہیں قریب بھی لے جاسکتے تھے۔ جہاں سے مجھے اغوا کیا تھا۔ گاڑی سے کھینچ کر مجھے نیچے اتارا گیا اور مختلف جگہوں سے گزار کر کہیں لے جایا جانے لگا اور جب ایک جھٹکے سے عینک اتاری گئی تو میں نے خود کو اسٹڈی روم نما ایک کمرے میں پایا۔ اس کے چاروں طرف شیشے کی الماریاں تھیں۔ جن میں کتابوں کے بجائے نوادرات سجے ہوئے تھے۔ وسط میں میز تھی، جس کے دوسری طرف کرسی پر بیٹھا شخص مسکرا کر مجھے دیکھ رہا تھا۔

”خوش آمدید جمانگیر۔“ اس نے کہا ”جیل سے واپسی مبارک ہو۔“

میرے ذہن میں دھماکا ہوا۔ میں نے وہ آواز پہچان لی۔ جو میں فون پر سنا کرتا تھا ”تم۔۔۔ تم آغا ہو۔“

”ذاکثر آغا صدی!“ وہ پھر مسکرایا ”بیماروں کا نہیں بلکہ جرائم کا۔ میں نے کرمنا لوجی میں پی ایچ ڈی کیا ہے مگر مجھے اعتراف ہے کہ میرے پاس تمہارے جیسا ذہن نہیں ہے۔“ میں دم بخود سا اس سرخ و سفید رنگت والے ادھیڑ عمر شخص کو دیکھ رہا تھا۔ اپنے بہترین سوٹ اور ہلکی فرنیچر کٹ داڑھی کے ساتھ وہ ایک معزز بزنس مین ضرور نظر آتا تھا مگر کسی جرائم پیشہ گروہ کا سرغنہ ہرگز نہیں۔ اچانک مجھے احساس ہوا کہ بظاہر خوش نما نظر آنے والے اس خبیث باطن شخص نے میرے گھر کو، میرے مستقبل کو اور خود مجھے تباہ کرنے میں مرکزی کردار ادا کیا تھا۔ میں اس پر جھپٹنے والا تھا کہ گوریلے نے عقب سے میرے دونوں بازو پکڑ لیے۔

”کینے، میں تجھے چھوڑوں گا نہیں۔“ میں نے چلا کر کہا۔ وہ ہنسا ”پھر جذباتیت، ایک تو میری سمجھ میں نہیں آتا کہ آج کل کا نوجوان اس قدر جذباتی کیوں ہے۔“

ان کا مفہوم اتنا ہی لرزہ خیز تھا۔ وہ شہزاد عباس کو صحتی سے مٹانے کی بات کر رہا تھا۔
”اس دفعہ ساٹھ کیا ہے؟“

”یہ میں صرف تمہاری رضامندی کی صورت میں بتاؤں گا لیکن اتنا یاد رکھو کہ اس کے بعد تم ہمیشہ کے لیے آزاد ہو گے۔“

یہ تو میں بھی سمجھ رہا تھا کہ میں ایک بار پھر مجبور تھا۔ اس کے باوجود میں نے سوچنے کی مہلت مانگ لی۔

”تم صرف دو دن میں فیصلہ کر لو۔ میرے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔“ یہ کہہ کر اس نے بن مانس سے کہا ”شریف جاکر ماہ روز کو بھیجو۔“ بن مانس ادب سے جھکا اور باہر نکل گیا لیکن اس کے جانے سے پہلے آغا نے پستول اٹھا کر اپنے کوٹ کی جیب میں رکھ لیا تھا۔ وہ ایسا ہی شخص تھا۔ جو اپنے سائے پر بھی بھروسا نہیں کرتا۔ کچھ دیر بعد کمرے میں جو لڑکی داخل ہوئی اسے دیکھ کر میں دنگ رہ گیا۔ اس کی وجہ اس کا بے مثال حسن نہیں تھا اور نہ جدید وضع کا وہ لباس جس کا مقصد پردہ پوشی سے زیادہ تشہیر تھا۔ میں یہ دیکھ کر حیران ہوا تھا کہ یہ وہی لڑکی تھی جس کی تصویر آغا کی میز پر پستول تلے رکھی تھی۔

”ماہ روز، یہ شخص اب تمہارے حوالے ہے۔ تم اس کی تمام ضروریات کی ذمہ دار ہو۔“

”آپ بے فکر رہیں آغا۔“ اس نے ادب سے کہا۔
میں لڑکی کے ساتھ جانے کے لیے اٹھا تو آغا نے مجھ سے کہا ”یاد رکھنا۔ اس عمارت میں داخلے اور اخراج کے تمام اختیارات میرے پاس ہیں اور جو لوگ اس سے تجاوز کرتے ہیں۔ وہ عموماً زندہ نہیں رہتے۔“

یہ شخص دھمکیاں بالکل فلمی انداز میں دیتا تھا۔ میں نے باہر نکلتے ہوئے سوچا۔ ماہ روز نامی یہ حسینہ مجھے اسی منزل کے ایک سچے سچائے کمرے میں لے آئی۔ اس نے تنقیدی نظروں سے میرا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔

”یہ تمہارا کمرہ ہے اور میرا خیال ہے کہ تم اپنا حلیہ درست کر لو۔ بالکل جیل سے بھاگے ہوئے قیدی لگ رہے ہو۔“

”بھاگا ہوا نہیں۔ رہا شدہ۔“ میں نے تصحیح کی ”میں آج ہی جیل سے رہا ہوا ہوں۔“

جب اس کی حیرت کچھ کم ہوئی تو وہ بولی ”تب تم نہالو اور چاہو تو شیو وغیرہ بھی کر لو۔ سامان اندر موجود ہے۔ الماری میں دیکھ لینا۔ تمہارے ناپ کے کپڑے بھی مل جائیں گے۔“

سامنے رکھے مختصر اور نفیس ساخت کے پستول پر جی ہونے لگی۔ پستول ایک لڑکی کی تصویر کے عین اوپر رکھا تھا اور مزے کی بات یہ تھی کہ پستول پر گلاب کی ایک ادھ کھلی کلی رکھی تھی۔ گویا بد صورتی کے ساتھ حسن جمع کر دیا تھا۔ حسین تو وہ لڑکی بھی تھی جس کی تصویر تھی۔ خوب صورت نقوش، قاتل آنکھیں، بوب کٹ ریشمی بال اور گلابی رنگت کسی کا بھی دین و ایمان غارت کرنے کے لیے کافی تھی۔ اس نے انوکھی ساخت کے بندے پن رکھے تھے۔ جس میں تکتون ہیرے جڑے ہوئے تھے۔ میں نے دل میں تولا۔ اگر میں اچانک پستول اٹھا کر آغا پر تان لوں تو اس کے زر خرید یقیناً مجھ پر گولی چلانے کی حماقت نہیں کریں گے۔ میں آغا کو پر غمال بنا کر یہاں سے نکل سکتا تھا مگر اس میں چانس ففٹی ففٹی تھا۔ میرے عقب میں موجود بن مانس مجھے پستول اٹھانے سے پہلے فوت کر سکتا تھا۔ وہ خالی ہاتھ بھی کچھ کم خطرناک نہیں تھا پھر مجھے شبہ تھا کہ پستول میں گولیاں نہیں تھیں۔ آغا اتنا احقر نہیں ہو سکتا کہ مجھ جیسے شخص کے سامنے ہتھیار رکھ دے۔ جو اس کے خون کا پیاسا ہو رہا تھا۔ کسی قدر غور و فکر کے بعد میں نے یہ خطرہ مول نہ لینے کا فیصلہ کیا۔

”تم نے کہا آخری مرتبہ۔ اس سے کیا مراد ہے؟“

آغا یا ڈاکٹر آغا صدیقی جو بغور میرے چہرے کے تاثرات کا جائزہ لے رہا تھا، مسکرا دیا ”یہ بہت بڑا کیم ہے۔ کم از کم پانچ کروڑ روپے کا۔ اس کامیابی کے بعد میں ملک چھوڑ دوں گا۔ اس ملک میں دیے بھی میرے لیے خطرات بڑھتے جا رہے ہیں۔ میں تمہیں بھی یہی مشورہ دوں گا۔ اس کامیابی میں تمہارا حصہ دس فی صد ہو گا۔ یعنی کم از کم پچاس لاکھ روپے۔“

ایک لمحے کو تو میرے جسم میں سنسنی سی دوڑ گئی۔ پچاس لاکھ ایک بہت بڑی رقم ہے۔ اس ملک میں شاید ایک فی صد لوگ بھی نہیں ہوں گے۔ جن کے پاس پچاس لاکھ ہوں مگر جب میں بولا تو میری آواز استہزائیہ تھی۔

”اور ناکامی کی صورت میں شاید میرے حصے میں ایک گولی آئے۔ اس پستول کی، جو پچیس روپے میں مل جاتی ہے۔“

”نہیں۔“ اس نے نفی میں سر ہلایا ”جو میں نے تم سے طے کیا ہے، وہ میں تمہیں پہلے ہی دے دوں گا۔ یعنی مکان، دیگر نقصانات کی تلافی اور تمہاری بچی۔ البتہ بیوی کا معاملہ میں تم پر چھوڑتا ہوں۔ میں اتنا کر سکتا ہوں کہ وہ شادی شدہ نہ رہے۔“ اس نے یہ الفاظ بہت سادہ انداز میں کہے تھے مگر

تھا۔ اس دفعہ میں نے صحیح دروازہ کھولا اور ایک وسیع و عریض ڈائننگ روم میں پہنچ گیا۔ وہاں رکھی میز پر کم از کم بیس آدمی کھانا کھا سکتے تھے مگر وہاں صرف ماہ روز میری منتظر تھی۔ ”صرف ہم دونوں کھائیں گے؟“ میں نے حیرت سے کہا۔

”ہاں۔“ اس نے میرے لیے کھانا پلیٹ میں ڈالا ”آغا اکیلے کھانا کھانے کے عادی ہیں۔“

”دوسرے افراد، میرا مطلب ہے آغا کے گھر والے۔“

”آغا کا اس دنیا میں کوئی خونی رشتہ دار نہیں ہے۔ جو تھے وہ ایک خونی انقلاب کی بھینٹ چڑھ گئے۔“

”تمہارا مطلب ہے ایرانی۔“

”ہاں، میرا مطلب خمینی انقلاب سے ہی ہے۔ اس وقت میں بہت چھوٹی تھی، مگر خونی مناظر ابھی تک میرے ذہن میں محفوظ ہیں۔ مجھے نہیں معلوم کہ میرے گھر والوں کا کیا قصور تھا۔ وہ شاہ کے حامی ہونے کے جرم میں مارے گئے یا دولت مند ہونے کے۔ ہمارا گھر بہت بڑا تھا اور بہت خوب صورت طریقے سے بنا ہوا تھا۔ حملہ آوروں کا پورا گروہ تھا۔ جو آتشیں اسلحے سے مسلح تھا۔ انہوں نے پہلے ہمارے گارڈز کو مارا اور اس کے بعد گھر میں گھس کر قتل عام شروع کر دیا۔ میں نہ جانے کس طرح بچ گئی اور جب مجھے ہوش آیا تو ہر طرف لاشیں اور خون دیکھ کر میں چیختی چلاتی باہر کی طرف بھاگی۔ سڑک پر آتے ہی ایک تیز رفتار کار مجھ سے آنکرائی اور میں بے ہوش ہو گئی۔ ہوش میں آنے کے بعد میں نے خود کو آغا کے پاس پایا۔ وہ ایران سے فرار ہو رہا تھا۔ خوش قسمتی سے کار نے مجھے صرف رگڑ ماری تھی ورنہ میری کمائی بھی وہیں ختم ہو جاتی۔“

کہتے کہتے اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے ”سوری!“

اس نے ٹٹو سے آنکھیں صاف کیں ”میں نے کھانے کے وقت تمہیں ڈسٹرب کر دیا۔“

یہ درست تھا اس کی داستان سن کر میرا دل بوجھل سا ہو گیا تھا اور بھوک یک لخت مر گئی تھی۔ جیسے تیسے میں نے اس لذیذ کھانے کو زہر مار کیا جو مجھے ایک طویل عرصے بعد کھانے کو ملا تھا۔ کھانے کے بعد اس نے پوچھا ”کافی یا چائے۔“

”کافی، فل کریم۔“ میں نے کہا اور سوچنے لگا۔ ان نعمتوں کے بغیر میں نے کتنا عرصہ گزارا تھا۔

”ایسا کرو، تم بالکونی میں بیٹھو میں کافی لے کر وہیں آتی ہوں۔“

”نی الوقت تو میں پیٹ پوجا کے موڈ میں ہوں۔ کھانے کو کچھ مل سکتا ہے۔“

”ڈنر میں ابھی ایک گھنٹا ہے۔“ اس نے گھڑی دیکھی۔

”اس کا مطلب ہے کہ مجھے نہالینا چاہیے۔“ میں نے آہ بھر کر کہا اور بادل ناخواستہ غسل خانے میں چلا گیا۔ جو ایسا ہی تھا جیسے ڈراموں اور فلموں میں امرا کے ہاتھ روم دکھائے جاتے ہیں۔ ایک طرف کی پوری دیوار میں آئینہ لگا ہوا تھا۔ ایک کونے میں جہازی ساز بکس تھا۔ اس کے ساتھ کے ریک پر قسم قسم کے شیپو، لوشن، پرفیومز اور تیل وغیرہ رکھے تھے۔ اسٹینڈ پر صاف ستھرے تولیے جگ مگا رہے تھے۔ اس ہاتھ روم میں سب سے گندی چیز میں خود تھا۔ ظاہر ہے جیل میں نہانے وغیرہ جیسی عیاشی کا موقع مہینے میں دو تین بار ہی ملتا تھا۔ آئینے میں مجھے ایک وحشی نظر آیا۔ سر کے بال اور داڑھی بڑھی ہوئی تھی۔ لباس میلا پھیلا تھا اور جسم پر میل کی موٹی تہ جمی ہوئی تھی۔

”جہانگیر میاں، اب آدمیت کے جامے میں آجاؤ۔“

میں نے خود کو مخاطب کیا۔

ایک گھنٹے بعد میں تولیا باندھ کر باہر نکلا تو خود کو بے حد ہلکا پھلکا محسوس کر رہا تھا۔ جیسے میل کے ساتھ روح کا بوجھ بھی اتر گیا ہو۔ جدید قسم کے ریزر نے میرے چہرے پر اگے جنگل کو صاف کر دیا تھا۔ ابھی میں الماری میں اپنے ناپ کے کپڑے تلاش کر رہا تھا کہ دروازہ کھلا اور ماہ روز اندر داخل ہوئی۔ میں اپنی ہیئت کدائی پر جھینپ گیا مگر اس پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ اس کے بجائے اس نے بغور میرا جائزہ لیا اور مسکرائی۔

”تم بالکل بدل گئے ہو۔“ اس کا انداز تعریفی تھا ”میرا خیال ہے۔ یہ سوٹ تمہیں فٹ آئے گا۔“

اس نے قطار سے ایک پینٹ شرٹ نکال کر مجھے تھمائی ”تبدیل کر کے اس گیلری میں دائیں طرف کے دوسرے کمرے میں آجاؤ۔ میں کھانے پر تمہاری منتظر رہوں گی۔“

میں اس کے اندازے کا قائل ہو گیا۔ جب کپڑے مجھے بالکل فٹ آئے۔ میں گیلری میں نکلا اور غلطی سے دائیں طرف کے بجائے بائیں طرف کے دوسرے کمرے کا دروازہ کھول دیا۔ اندر بن مانس لی وی پر ایک فلم دیکھ رہا تھا۔ جس میں شاید پتھر کے زمانے کے خواتین و حضرات نظر آرہے تھے۔ وہ لباس وغیرہ کے تکلفات سے آزاد تھے اور نہایت قابل سنسر قسم کی حرکات کر رہے تھے۔ میں نے بوکھلا کر دروازہ بند کیا مگر اس سے پہلے میں بن مانس کے منتخب کلمات سن چکا

بلوچستان کی طرف سے فرار کا پروگرام بنایا تھا کیونکہ انقلابی حکومت کی توجہ زیادہ تر مغربی حصوں کی طرف تھی۔ جہاں سے شاہ کے حامی یورپ اور ترکی کی طرف فرار ہونے کی سعی کر رہے تھے مگر مشرقی سرحد کی جانب ان کی خاص توجہ نہیں تھی۔

فرار کے لیے وہ دو جہیوں میں سوار تھے۔ ہم رات کے وقت سفر کرتے اور دن میں کہیں چھپ جاتے۔ راستے میں صرف دو جگہ ایندھن اور خوراک لینے کے لیے رکے تھے۔ تیسرے دن ہم سرحد کے قریب تھے کہ پاسداری کے ایک دستے سے ہمارا سامنا ہو گیا۔ فوراً ہی دونوں گروپ مورچا بند ہو کر فائرنگ کرنے لگے۔ جلد آغا نے محسوس کر لیا کہ پاسداران کا پلہ بھاری ہے۔ ان کی تعداد بھی زیادہ تھی اور ان کے پاس نسبتاً زیادہ تباہ کن اسلحہ تھا۔ لہذا آغا نے اپنے آدمیوں کو پسپا ہونے کی ہدایت کی۔ اس سے پہلے انہوں نے قیمتی سامان کے بکس جیپ سے اتارنا شروع کر دیئے۔ ابھی چند ہی بکس اترے تھے کہ ایک بھٹکی ہوئی گولی آکر جیپ کے پیٹرول ٹینک پر لگی اور اس نے آگ پکڑ لی۔ اتنا وقت نہیں تھا کہ جلتی جیپ سے باقی بکس اتارے جاتے۔ مجبوراً آغا کے آدمی جو ہاتھ لگا اسے لے کر پہاڑوں میں پسپا ہونے لگے۔ پاسداران نے ہمارا تعاقب کیا مگر فائرنگ اور دو آدمیوں کے نقصان کے بعد انہوں نے تعاقب ترک کر دیا۔

”تم لوگ پاکستان آگئے؟“ میں نے پوچھا۔
 ”ہاں۔ یہ بھی ایک طویل کہانی ہے۔ ابتدا میں کچھ عرصے تو ہم چھوٹے شہروں میں بھٹکتے رہے پھر یہاں کا ریخ کیا۔ آغا کے ساتھ اس کے ابتدائی دور کے صرف دو ساتھی رہ گئے۔ باقی مارے گئے تھے، پھٹڑ چکے تھے یا پھر از خود آغا کو چھوڑ دیا تھا۔ اس شر کو آغا نے اپنی سرگرمیوں کے لیے مناسب پایا اور ہم جلد یہاں سیٹ ہو گئے۔“

”تم لوگوں نے یہاں بھی مجرمانہ زندگی کو اپنایا۔“ میں نے تلخ لہجے میں کہا۔
 ”مجبوری تھی۔ آغا ایک یہی کام جانتے ہیں ویسے اب ان کا ارادہ ریٹائر ہونے کا ہے۔ ایک مغربی ملک میں انہوں نے اپنا کاروبار سیٹ کر لیا ہے۔“

”پھر بلاوجہ خطرہ مول لینے کی کیا ضرورت ہے۔“ میں نے کہا۔
 ”یہ آغا جانیں پھر دولت کے اچھی نہیں لگتی۔“ ماہ روز کے شانے اچکانے کا انداز بڑا دلچسپ تھا۔
 ”آغا کے دیگر ساتھیوں کا کیا ہو گا؟“

ڈانگ ہال کے برابر میں شیشے کی دیوار تھی۔ جس کا سلاڈنگ ڈور بالکونی میں کھلتا تھا۔ مجھے حیرت تھی کہ گراؤنڈ فلور پر بالکونی کہاں سے آگئی مگر جب باہر نکلا تو سمجھ میں آ گیا۔ یہ عمارت ڈھلان ہی تھی۔ جو پیچھے سے اتنی نیچے تھی کہ فرش زمین سے تقریباً پارہ فٹ بلند ہو گیا تھا۔ لہذا میسر کو بالکونی کی شکل دے دی گئی تھی۔ وہاں میز اور کرسیاں بھی بڑی تھیں۔ سامنے ڈھلان جا کر سیدھی ہو گئی تھی اور اسے ایک خوب صورت باغ کی شکل دے دی گئی تھی۔ یہ کوٹھی خاصے وسیع و عریض رقبے پر پھیلی ہوئی تھی اور اس کی چار دیواری اتنی بلند تھی کہ اس کے پار دیکھنا ممکن نہیں تھا۔ حالانکہ میں خاصی بلندی پر تھا۔

”کافی۔“ اس نے پیچھے سے چچی بجایا تو میں چونک گیا۔
 ”آغا تمہیں لے کر یہاں آگیا پھر وہ جرائم کے چکر میں پڑ گیا۔“

”نہیں۔“ اس نے سر ہلایا ”آغا تھران یونیورسٹی میں پڑھاتا تھا لیکن اس کا ذہن شروع سے جرائم کی راہ پر چل نکلا تھا۔ اس نے بہت پہلے سے شاہ کے خلاف عوامی ذہن کو بھانپ لیا تھا اور اپنے اثاثے بیرون ملک منتقل کرنا شروع کر دیئے تھے، مگر حالات اس کی توقع سے زیادہ تیزی سے خراب ہوئے۔ ڈاکٹر آغا شاہ کے زبردست حامیوں میں سے تھا۔ لہذا انقلابی سب سے پہلے اس کے گھر پر چڑھ دوڑے۔ اس وقت آغا ایک ضروری کام سے بحیرہ کیسین کے ایک ساحلی قصبے تک گیا تھا۔ اس کی غیر موجودگی میں اس کے تمام گھروالے مارے گئے اور جب وہ واپس آیا تو گھر کی جگہ جلے ہوئے بلے کا ڈھیر تھا۔ مرنے والوں میں آغا کی بیوی اور اس کے دو بیٹے بھی شامل تھے۔

”آغا نے اس دکھ کو برداشت کیا اور اپنی جان بچانے کے لیے اس نے فوراً ملک سے نکلنے کا فیصلہ کیا۔ وہ کار میں اپنے ایک ٹھکانے کی طرف جا رہا تھا کہ میں اس کی کار سے ٹکرا گئی۔ میری حالت سے وہ سمجھ گیا کہ میں بھی انقلاب کی ماری ہوں۔ لہذا اس نے مجھے ساتھ لے لیا۔ اس ٹھکانے پر آغا کے گروہ کے دیگر آدمی جمع تھے اور انہوں نے فرار کی تیاریاں کر رکھی تھیں۔ آغا عام جرائم کے بجائے ہمیشہ خاص نوعیت کے جرائم میں دلچسپی رکھتا تھا۔ خاص طور سے نوادرات، قیمتی پتھروں سے اسے بے حد دلچسپی تھی اور یہی اس کی وارداتوں کا محور تھا۔ فرار کے وقت اس کے پاس نوادرات اور قیمتی پتھروں اور زیورات کی شکل میں بہت بڑا خزانہ تھا۔ اس میں کئی اشیاء تاریخی اہمیت کی حامل تھیں۔ انہوں نے ایرانی

شرط کے بدلے شرکت کر رہا تھا۔ اس سے پہلے میں نے ہمیشہ مجبوراً اس کا ساتھ دیا تھا۔ مجھے یہ لڑکی بھی اچھی لگی تھی مگر یہ ان جرائم پیشہ افراد کے ساتھ تھی اور ان ہی کی ساتھی تھی۔ بظاہر آغا نے اسے میری خدمت پر مامور کیا تھا مگر درحقیقت وہ مجھے ایک بار پھر آغا کے لیے کام کرنے پر مجبور کرنے کے لیے ساتھ لگائی گئی تھی۔ آغا نے اپنے ترش کاسب سے مؤثر تیر میری طرف چھوڑا تھا۔ اس کی میزبانی اور رفاقت نے حیرت انگیز طور پر مجھے نرم کر دیا تھا۔

اگلی صبح مجھے اس اطلاع کے ساتھ بیدار کیا گیا کہ آغا ناشتے کی میز پر میرا منتظر ہے۔ غسل اور دیگر ضروریات سے فارغ ہو کر میں ایک ملازم کے ساتھ ڈائننگ روم کے ساتھ بالکونی پہنچا۔ آغا نیوزویک پڑھ رہا تھا۔ ناشتا انگلش اسٹائل کا تھا۔ یعنی ٹوس، ہاف بوائس اور ہاف فرائی انڈے، چائے، مکھن، مارجرین اور جام۔ آغا خاصا خوش نظر آ رہا تھا۔

”تم خاصی دیر سے آئے ہو۔“ اس نے کہا ”خیر ناشتا ابھی ٹھنڈا نہیں ہوا ہے۔“

”تم بہت خوش نظر آرہے ہو۔ کوئی خاص بات؟“ میں نے سرسری انداز میں کہا۔

”تمہاری رضامندی میرے لیے بہت بڑی خوش خبری ہے۔“

”لیکن میری کچھ شرائط بھی تھیں۔“

”مجھے منظور ہے۔ آج ہی سب کچھ ہو جائے گا۔“ اس نے کہا ”لیکن پہلے ناشتا۔“

ہم نے خاموشی سے ناشتا کیا۔ اس کے بعد ہم چائے پی رہے تھے کہ نیچے پورچ میں آکر ایک کارر کی اور اس میں سے جو افراد برآمد ہوئے انہیں دیکھ کر میرے ہاتھ سے کپ گرتے گرتے پچا۔ آغا کے آدمی شنزاد عباسی اور شبہم کو اپنے زرخے میں لا رہے تھے۔ شبہم کی گود میں یقیناً حنا تھی۔ میں بے تاب سے کھڑا ہوا۔ کتنے عرصے بعد اپنی بیٹی کو دیکھ رہا تھا۔ جیل میں حنا کو لانے سے میں نے خود منع کر دیا تھا۔ وہ تینوں بے حد ہراساں نظر آرہے تھے۔

”تمہاری شرط کا ایک حصہ۔“ آغا نے مجھے چونکایا ”دوسرے حصے کی تکمیل تمہارے سامنے ہوگی۔“

چند لمحے بعد شنزاد اور شبہم مجرموں کی طرح میرے سامنے کھڑے تھے۔ میں نے شبہم کی طرف دیکھا یہ وہ عورت تھی جس کا میں ایک وقت میں دیوانہ ہوا کرتا تھا۔ اس کے لیے موت سے بھی لڑ جاتا مگر اس نے مجھے کیا دیا۔ بے وفائی کی ذلت اور دھوکا۔ اس کی گود میں حنا سمی ہوئی نظروں سے

”وہ سب بھی یہاں سے نکل جائیں گے۔ ان کے پاسپورٹ اور ویزے تیار ہیں۔ آغا انہیں اتنا کچھ دے دیں گے۔ جس سے وہ کسی بھی ملک میں ایک خوش حال زندگی کا آغاز کر سکتے ہیں۔“

میں سوچنے لگا کہ کیا یہ ایک ترغیب تھی۔ آغا اپنا کام جبر سے نکلوانے کے بجائے حکمت عملی سے نکلوا رہا تھا۔ اگر وہ ایسا کر رہا تھا تو اس کی ایسی کم تیس۔ جیل جانے سے پہلے میں نے قسم کھائی تھی کہ اپنی بربادی کے ذمے داروں سے انتقام لوں گا۔ رہائی کے بعد میں نے اس قسم میں شبہم اور شنزاد عباس کو بھی شریک کر لیا تھا۔ آغا تو از خود سامنے آ گیا تھا مگر شنزاد اور شبہم لاپتا تھے۔ البتہ آغا نے جتنے وثوق سے ان کے بارے میں بات کی تھی اس سے ایسا لگتا تھا کہ وہ ان کے بارے میں جانتا تھا۔ میرے لیے یہ مشکل تھا کہ آغا کے قبضے میں رہتے ہوئے انہیں تلاش کر سکوں۔ لہذا یہ کام میں نے آغا سے لینے کا فیصلہ کیا۔

”میرا خیال ہے تمہیں آرام کی ضرورت ہے۔“ ماہ روز نے کافی کے کپ ٹرے میں رکھے۔

”ہاں لیکن ایک بات مجھے کھٹکتی رہے گی۔ آغا آخر مجھ سے کیا کام لینا چاہتا ہے۔“

”وہی جو وہ پہلے بھی تم سے لیتے رہے ہیں۔“

”دیکھو مجھے جاننے کا حق ہے۔“ میں نے تیز لہجے میں کہا ”میں پہلے ہی اپنی زندگی کے تین قیمتی سال جیل کی نذر کر آیا ہوں۔“

اس نے میری آنکھوں میں دیکھا ”اگر تمہیں معلوم ہو جائے کہ یہ کام بے حد خطرناک اور مشکل ہے تو۔۔۔“

”تو۔۔۔“ میں گڑبڑا گیا۔ اس صورت کے بارے میں تو میں نے سوچا ہی نہیں تھا۔

”مسٹر جہانگیر تم انکار کی پوزیشن میں نہیں ہو۔ لہذا اپنی سوچوں کو مت الجھاؤ۔“

”ٹھیک ہے میں تیار ہوں لیکن میری کچھ شرائط ہیں۔“ اس کی آنکھیں چمک اٹھیں ”اس صورت میں آغا تمہارے لیے سب کچھ کر سکتے ہیں۔“ وہ پرجوش انداز میں بولی۔

”مجھے اپنا مکان اور اپنی بچی چاہیے۔“ میں نے فیصلہ کن لہجے میں کہا ”جب یہ دونوں کام ہو جائیں گے تو میں آغا کے ہر حکم کی تعمیل کروں گا۔“

میں اپنے کمرے میں آیا تو عجیب احساسات میرے ذہن پر مسلط تھے۔ یہ پہلا موقع تھا کہ میں آغا کے جرم میں کسی

ایک ایک کو دیکھ رہی تھی۔ اچانک وہ چیئی۔

”پاپا، مجھے بچالیں۔“

میں نے چونک کر اسے دیکھا تو وہ میری طرف دیکھ کر کہہ رہی تھی پھر دیکھتے ہی دیکھتے وہ شبہم کی گود سے اتر کر مجھ سے لپٹ گئی۔

”پاپا، آپ کہاں چلے گئے تھے۔ مجھے ان سے ڈر لگ رہا ہے۔ مجھے بچالیں پاپا۔“

میرا دل مسرت سے بھر گیا۔ میری بچی نے مجھے پہچان لیا تھا۔ میں نے اسے سینے میں بھینچ لیا۔ ”میری گڑیا کو کوئی کچھ نہیں کہہ سکتا۔“

”تم نے جہانگیر کا مکان کتنے میں فروخت کیا؟“ آغا نے شہزاد سے پوچھا۔

”یہ۔۔۔ یہ شبہم کی تجویز تھی“ اس نے مجھ سے نظریں چراتے ہوئے کہا۔

”میں نے جو پوچھا ہے اس کا جواب دو۔“ آغا گر جا۔

”ساڑھے چار لاکھ میں۔“ شہزاد جلدی سے بولا۔

اور سامان۔۔۔

”وہ بھی تقریباً ایک لاکھ کا تھا۔“

”اسے چیک بک دو۔“ آغا نے اپنے آدمی کو حکم دیا جو ان لوگوں کو لایا تھا۔ اس نے مستعدی سے چیک بک شہزاد کے سامنے کر دی۔ ”اس پر ساڑھے سات لاکھ کا چیک لکھو۔“

”مگر۔“ شہزاد نے کہنا چاہا تو آغا کے آدمی نے اپنا پستول سختی سے اس کی گردن سے نکال دیا۔ اس نے لرزتے ہاتھوں سے چیک لکھا۔

”اگر یہ چیک کیش نہ ہوا تو تمہارا چیک کٹ جائے گا۔ اس دنیا سے۔“ آغا نے چیک پھاڑتے ہوئے اسے آگاہ کیا پھر ماہ روز کو چیک دیا۔

”جا کر اسے کیش کرا لاؤ۔“

”اس عورت کا تم کیا چاہتے ہو؟“ آغا نے مجھ سے کہا۔ معاً میرے اندر کی تشکش اپنے اختتام کو پہنچ گئی۔ میں نے ٹھہرے ہوئے انداز میں کہا ”اس کے لیے میرے پاس صرف ایک ہی چیز ہے۔ شبہم خان ولد اشفاق خان میں پورے ہوش و حواس سے تمہیں تین دفعہ طلاق شرعی دیتا ہوں۔ یہی لکھا تھا اس کاغذ پر جس کے دھوکے میں تم لوگ اب تک گناہ کی زندگی گزارتے آئے ہو۔ آغا انہیں جانے دو۔ حنا اب میرے پاس ہی رہے گی۔“

”نہیں“ شبہم میری طرف جھٹی۔ آغا کے گرگے نے اسے

پکڑ کر پیچھے کھینچا۔ ”چھوڑ دو مجھے۔ میں اپنی بچی لے کر جاؤں گی۔“ وہ چیختی چلاتی رہ گئی اور میں حنا کو لے کر اپنے کمرے میں آ گیا۔ اس نے سسے ہوئے انداز میں کہا۔

”پاپا، وہ شخص امی کو مارے گا تو نہیں۔“

”نہیں میری جان۔“ میں نے اس کی پیشانی چومی ”وہ تمہاری امی کو ان کے گھر چھوڑ آئے گا۔“

”پاپا، آپ مجھے چھوڑ کر تو نہیں چلے جائیں گے۔“

میں اسے یقین دلانے لگا کہ میں اب کبھی اسے چھوڑ کر نہیں جاؤں گا۔ اسی لمحے ماہ روز کمرے میں داخل ہوئی۔

”جہانگیر تمہیں آغا طلب کر رہے ہیں پھر حنا کی طرف دیکھا اور کہا ”اور حنا میرے ساتھ جائے گی“ زود دیکھنے۔“

”چڑیا گھر۔“ وہ خاموش ہو کر بولی۔

”نہیں ہم نے تمہارے لیے یہیں چڑیا گھر بنا رکھا ہے۔“ اس نے کہا اور حنا کو گود میں لے کر باہر نکل گئی۔

آغا اپنے اسٹڈی روم میں میرا منتظر تھا۔ اس کے سامنے کچھ نقشے اور فوٹو گرافس پھیلے ہوئے تھے۔ اس نے مجھے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ میرا خیال ہے تم مطمئن ہو گئے ہو گے؟“ اس نے کہا۔

”کسی حد تک۔“ میں نے مبہم سا جواب دیا۔

اس نے ایک لفافہ میری طرف بڑھایا۔ اس میں ساڑھے سات لاکھ روپے ہیں۔“ اس نے کہا ”میرا خیال ہے اب تم کام کے لیے پوری طرح تیار ہو گے۔ یہ فوٹو گرافس دیکھو۔“

فوٹو گرافس ایک جدید وضع کی چھ منزلہ عمارت کے تھے۔ جس کے ایک طرف لمبے اور عمودی ہو رڈنگ پر ایک بین الاقوامی بینک کا نام لکھا تھا۔ دیگر فوٹو گرافس اس کے چاروں اطراف کے اور اندر کے تھے۔ آغا نے ڈرامائی انداز میں کہا۔

”یہ ہماری آخری سائٹ ہے اور ہمارا ہدف اس کی چھٹی منزل تک پہنچنا ہے۔ وہاں بینک کا سیف روم ہے۔“

ملک میں غیر ملکی بینکوں کو کام کرنے کی اجازت ملتے ہی اس بینک نے سب سے پہلے اپنی براؤنچ قائم کی تھی اور اب پورے ملک میں اس کی درجن بھر شاخیں کام کر رہی تھیں۔ البتہ ہیڈ آفس یہی عمارت تھی۔ کچھ عرصے پہلے بینک نے اپنے دولت مند گاہکوں کے لیے سیف روم سروس شروع کی تھیں۔ جسے ایس آر ایس اسکیم کا نام دیا گیا تھا۔ یہ گراں قدر معاوضے پر لوگوں کی قیمتی اشیاء سیف روم میں محفوظ کرتا تھا۔ ایک ترقی پذیر ملک میں جہاں امن و امان کی صورت حال

کے قریب رک گیا تھا۔ سلاخوں کے درمیان چھ انچ کا فاصلہ تھا جن سے وہ درندہ باہر نہیں آسکتا تھا مگر اپنا پنجہ نکال سکتا تھا۔ حنا بے خبری میں اس کی طرف بڑھ رہی تھی۔ میرے دل کی دھڑکنیں بڑھتی جا رہی تھیں۔ میں نے بے تابی سے کھڑکی کا شیشہ کھولنے کی کوشش کی مگر یہ کھلنے والا شیشہ تھا ہی نہیں۔ اسے صرف توڑا جاسکتا تھا۔ میں آغا کی طرف مڑا جو معنی خیز انداز میں مسکرا رہا تھا۔

”آغا، یہ کیا چکر ہے۔ تم میرے ساتھ کون سا کھیل کھیل رہے ہو۔“

”موت اور زندگی میں ذرا سا فاصلہ ہوتا ہے۔ ذرا سی غلطی سے یہ فاصلہ مٹ جاتا ہے۔“ اس نے کھڑکی کے باہر دیکھا۔

حنا جنگلے کے بہت قریب چل گئی تھی۔ اگر وہ ایک قدم اور بڑھ جاتی تو اتنے نزدیک چلی جاتی کہ وہ درندہ اسے پنجہ مار سکتا تھا۔ اس لمحے میں نے عجیب سی بے بسی محسوس کی۔ میں حنا کو روک دینا چاہتا تھا لیکن نہ روک سکا۔ میں آغا کو قتل کر دینا چاہتا تھا مگر نہیں کر سکا۔ میں خاموشی سے کھڑا دیکھتا رہا۔ حنا نے ماہ روز کو پکڑنے کے لیے ہاتھ لہرائے، وہ لڑکھڑائی اور پیچھے کی طرف گرنے لگی جہاں وہ درندہ گھات لگائے بیٹھا تھا۔ حنا کو قریب آتے دیکھ کر اس نے اپنا خوف ناک پنجہ دراز کیا اور کوئی لمحہ جاتا تھا کہ وہ حنا کو پکڑ کر اپنی طرف کھینچ لیتا۔ بے اختیار میرے منہ سے چیخ نکل گئی۔ عین اسی لمحے جب چیتا حنا کو پنجہ مارنے والا تھا، ماہ روز نے لڑکھڑائی حنا کو اپنی طرف کھینچ لیا اور گود میں لے کر ہنستی ہوئی واپس چل پڑی۔ حنا کو معلوم ہی نہیں ہوا کہ موت اس کے کتنے قریب سے گزر گئی تھی۔ لیکن میں نے دیکھا تھا اور دہشت سے میرا رُواں لرز رہا تھا۔ میں نے سختی سے اپنا منہ بند کر رکھا تھا ورنہ اس میں سے آغا کے لیے ایسی نادر..... گالیاں نکلتیں جو یقیناً اس نے پہلے کبھی نہ سنی ہوتیں۔

”ذرا سی غلطی موت اور زندگی کے فاصلے کو ختم کر دیتی ہے اور میرا خیال ہے تم یہ بات سمجھ گئے ہو گے۔“ آغا نے مسکرا کر کہا۔

میں نے دانت بھینچ کر کہا ”آغا اگر میری بیٹی کو کچھ ہو جاتا تو میں اس گھر کو آگ لگا دیتا اور تم غور سے سن لو، اگر تم چاہتے ہو کہ میں ایک کامیاب پلان بناؤں تو مجھ پر سے ہر قسم کی پابندی ہٹالو۔ میں کیا کرنا ہوں، کہاں جاتا ہوں اور کب جاتا ہوں۔ اس سے تمہیں کوئی غرض نہیں ہونا چاہیے۔ ضمانت کے طور پر میری بیٹی تمہارے پاس ہے ہی۔“

خراب ہو اور کالے دھن کی فراوانی ہو، لوگ اس قسم کی اسکیموں میں دلچسپی لیتے ہیں لہذا اسکیم کے اجرا کے ایک مہینے کے اندر سیف روم سروس کے گاہکوں کی تعداد ایک ہزار سے..... تجاوز کر گئی۔ اس سیف روم کا سرکاری اور نجی اداروں نے بھی فائدہ اٹھایا۔ جن میں سونے اور جواہرات کے کاروبار کرنے والی کمپنیاں بھی شامل تھیں۔

”میرے محتاط اندازے کے مطابق کم از کم پانچ کروڑ روپے مالیت کی اشیا ہوں گی۔ جن سے ہمیں دلچسپی ہو سکتی ہے۔“ آغا نے سگار سلگاتے ہوئے کہا ”فضا میں نفیس تمباکو کی خوشبو پھیل گئی۔“ میرے پاس تمام ممکنہ وسائل اور افرادی قوت موجود ہے۔ اگر کسی ہے تو صرف ایک قابل عمل پلان کی۔ مجھے امید ہے کہ یہ کمی بھی پوری ہو جائے گی۔“

”میری پوری کوشش ہوگی۔“

”کوشش نہیں۔“ اس نے میری بات کاٹی ”یہ کام سو فیصد ہونا چاہیے۔ میں نے اپنا سب کچھ داؤ پر لگا دیا ہے۔ اپنی زندگی اور آزادی بھی لہذا مجھے ناکامی نہیں چاہیے۔“ وہ اٹھا اور کھڑکی کے پاس جا کر کھڑا ہو گیا۔

”اتفاقات اور بے وقوفیوں کا ذمے دار میں نہیں ہوں۔“ میں نے خشک لہجے میں کہا۔

”ہوں۔“ وہ کتنا پیارا منظر ہے۔ آؤ تم بھی دیکھو۔“

اس کے لہجے میں کوئی ایسی بات تھی کہ میں بے اختیار اٹھ کر کھڑکی کے پاس پہنچ گیا۔ سامنے دور تک پھیلے سبزہ زار کا یہ حصہ باغ سے بالکل الگ تھا۔ اس میں لوہے کی جالیوں اور سلاخوں سے مختلف پنجرے بنے ہوئے تھے۔ جن میں سے کچھ کھلے تھے اور کچھ کے اوپر چھت تھی۔ حنا اور ماہ روز ایک کھلے حصے میں کھیل رہے تھے۔ حنا کی آنکھوں پر پٹی بندھی تھی اور وہ ماہ روز کو پکڑنے کی کوشش کر رہی تھی۔ ایسی کسی کوشش میں ناکامی کے بعد وہ کھلکھلا کر ہنس دیتی۔ شیشے کی وجہ سے ان کی آوازیں مجھ تک نہیں آرہی تھیں مگر ان کے ہنستے چہرے اور جسمانی حرکات سے ظاہر تھا کہ وہ اس کھیل سے پوری طرح لطف اندوز ہو رہی تھیں۔ اچانک میری نگاہ کچھ فاصلے پر موجود جنگلے میں موجود جانور پر پڑی۔ یہ شاید چیتا تھا یا پھر تینڈوا مگر اس کا رنگ بالکل سیاہ تھا اور وہ دبے پاؤں جنگلے کی طرف آ رہا تھا۔

”یہ شوبی ہے۔“ آغا کی آواز آئی ”اگرچہ عمر رسیدہ ہو گیا ہے مگر اس کی خون خواری میں کوئی کمی نہیں آئی ہے۔“ میری تمام تر توجہ درندے اور حنا کی طرف تھی جن کے درمیان فاصلہ کم ہوتا جا رہا تھا۔ درندہ خاموشی سے آکر جنگلے

یہ صورت دیگر میری طرف سے انکار سمجھو۔ اب نتائج کی مجھے قطعی پروا نہیں ہے۔“

آغا کچھ دیر سوچتا رہا پھر بولا ”مجھے منظور ہے مگر تمہاری کامیابی اور ناکامی پر تمہاری بیٹی کی زندگی اور موت کا انحصار ہوگا۔“



کئی گلیوں میں چکرانے کے بعد مجھے یقین ہو گیا کہ کوئی میرے تعاقب میں نہیں ہے تو میں نے گاڑی مطلوبہ سمت میں موڑ دی۔ کچھ دیر بعد میں ایک تین منزلہ عمارت کے سامنے رکا۔ جو شاید انگریزوں کے دور سے کھڑی تھی اور اگر دائیں بائیں سے دو عمارتوں نے اسے سہارا نہ دیا ہوتا تو کب کی گر چکی ہوتی۔ یہاں گلیاں پختہ تھیں مگر جاہ جاکوڑا پڑا تھا اور غلیظ پانی بہہ رہا تھا۔ میں نے گلی میں کھیلنے والے ایک بچے کو روکا۔

”بیٹا، اللہ دتا کہاں رہتا ہے؟“

”اللہ کے پاس۔“ اس نے بد تمیزی سے کہا اور دوڑ گیا۔ کئی لڑکوں سے یہی جواب سننے کے بعد بالآخر ایک لڑکے نے مجھے اس کے فلیٹ کا نمبر بتا دیا۔ جو تیسری منزل پر تھا۔ نہیوں پر قدم رکھنے سے پہلے میں نے دعا کی کہ میری موجودگی میں یہ عمارت نہ گرے اور ٹوٹے زینے طے کر کے اوپر پہنچ گیا۔ وہاں کسی دروازے پر کوئی نمبر وغیرہ نہیں تھا۔ پہلی دستک کے جواب میں ایک خاتون خود اپنا اشتہار بنی برآمد ہوئیں۔ ان کے خیال میں اللہ میاں نے انسانوں کو آنکھیں اسی مقصد کے لیے دی تھیں کہ وہ انہیں دیکھیں۔ حالانکہ اگر ان کا وزن اور عمر نصف بھی ہوں تو وہ دیکھے جانے کے لائق نہیں تھیں۔

”فرمائیے۔“ انہوں نے شیریں لہجے میں کہا ”بلکہ تشریف لائیے۔“

”مجھے اللہ دتا سے ملنا ہے۔“ میں نے جلدی سے کہا۔ اس سے پہلے کہ وہ مجھے اندر کی جانب کھینچنا شروع کر دیتی۔ خاتون نے شعلہ بار نظروں سے مجھے دیکھا ”تو پھر جہنم میں جاؤ۔ یہاں کیوں آگئے؟“

مزید دو دروازوں پر شرمندگی اٹھا کر میں نے صحیح دروازے پر دستک دی۔ اللہ دتا نے دروازہ کھولا تو میں اسے دیکھ کر بھونچکا رہ گیا۔ وہ اپنی عمر سے پچیس برس کم کا نظر آ رہا تھا پھر مجھے اپنی حماقت کا احساس ہوا۔ وہ یقیناً اللہ دتا کا بیٹا تھا۔

”جہانگیر۔“ میں نے اس کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے

کہا ”مجھے اللہ دتا صاحب سے ملنا ہے۔“

”اوہ۔“ وہ چونکا ”آئیے اندر آئیے۔“ وہ مجھے ایک نشست گاہ میں لے گیا۔ ”فرمائیے آپ ابا جان سے کیوں ملنا چاہتے ہیں۔“

”یہ تو میں انہیں ہی بتا سکوں گا۔“

اس نے سر ہلایا ”تب مجھے افسوس ہے۔ وہ فوت ہو چکے ہیں۔ دو برس پہلے اسی فلیٹ میں کچھ نامعلوم افراد انہیں شوٹ کر گئے تھے۔“

میں دم بخود رہ گیا۔ اس لیے بچے اور وہ خاتون مجھے اوپر جانے کا مشورہ دے رہے تھے۔

”آئی ایم سوری۔“ مجھے معلوم نہیں تھا۔

”کوئی بات نہیں۔“ وہ مسکرایا ”خیر اگر آپ کو والد صاحب سے خصوصی نوعیت کا کوئی کام تھا تو میں حاضر ہوں۔“

”کام تو خصوصی نوعیت کا ہی ہے مگر تم۔۔۔“

”آپ سو فیصد اطمینان رکھیں۔ جتنا اعتماد آپ والد صاحب پر کر سکتے تھے، اتنا ہی مجھ پر کر سکتے ہیں۔ آپ کے اطمینان کے لیے میں فیس بعد میں لے لوں گا۔ کام کی تکمیل کے بعد۔“

”گڈ۔“ میں نے اسے پاسپورٹ دلیتے ہوئے کہا ”مجھے اس پر امریکا، جرمنی یا کینیڈا کا ویزا چاہیے۔“

اس نے سر ہچکایا ”جہانگیر صاحب، بات یہ ہے کہ گوروں نے آج کل اس سلسلے میں بہت سختی کر دی ہے۔ اگر آپ چاہیں تو میں اس پرویزالگا سکتا ہوں۔“ اس نے معنی خیز انداز میں کہا ”نفل بہ مطابق اصل۔ خود امریکی چکر ابا میں گئے۔“

”ٹھیک ہے۔“ میں نے کہا اور اسے چند اور کام بتائے۔ وہ سر ہلا کر سنتا رہا۔ آخر میں بولا۔

”آپ بے فکر رہیں۔ سب ہو جائے گا مگر ان سب پر ملا کر ایک لاکھ کا خرچہ آئے گا۔“

”منظور ہے مگر کام میری مرضی کے مطابق اور وقت پر ہونا چاہیے۔“ میں نے کہا۔

”آپ بے فکر رہیں۔“

وہاں سے نکل کر میں ایک کرنسی ڈیلر کے پاس گیا اور چھ لاکھ روپے کے عوض امریکی ڈالر حاصل کر لیے۔ یہ مجھے بینک ریٹ سے ذرا منگے ملے۔ اس کے بعد میں نے کچھ اور ضروری کام نمٹائے اور جب شام کو واپس آغا چلیس آیا تو خاصا مطمئن تھا۔



”یہ تو آپ کو ہماری بیگم ہی بتائیں گی۔“ میں نے مسکرا کر کہا ”سیف روم کی اصل ضرورت انہیں ہی ہے۔“ گویا میں ایک ایسے شوہر کا کردار ادا کر رہا تھا۔ جو بیوی کی فرمائش پر بادل ناخواستہ کسی جگہ چلا آیا ہو۔ اس پر ماہ روز نے کسی بیوی کی طرح خفگی سے مجھے دیکھا۔ ”تو گویا میرا نقصان آپ کا نقصان نہیں ہے۔ اگر خدا ناخواستہ اس دن وہ ڈاکو کامیاب ہو جاتے تو۔“

”اوکے۔“ میں نے سعادت مند شوہر کی طرح فوراً ہتھیار ڈال دیے ”تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔“

یہاں آنے سے پہلے مجھے خاصی تیاری کرنا پڑی تھی۔ پندرہ دن تک میں ماہ روز کے چارج میں رہا تھا۔ اس نے سب سے زیادہ توجہ میری شخصیت کی تبدیلی پر دی تھی۔ جیل کی سختیوں کے اثرات میرے چہرے اور جسم سے واضح تھے۔ چہرے پر ایک قسم کا پتھر بلا پن آگیا تھا اور ہاتھ پیر سخت اور کھردرے ہو گئے تھے۔ میرا وزن بھی معمول سے کم ہو گیا تھا۔ ماہ روز نے میرے لیے خاصا سخت شیڈول بنایا تھا۔ صبح چھ بجے اٹھتا، ہلکی ورزش اور باڈی بلڈنگ کے بعد بھاپ سے غسل، اس کے بعد آدھے گھنٹے کی سوئمنگ، ناشتے کے بعد ایک گھنٹے تک مختلف اخبارات اور رسائل کا مطالعہ۔ جن میں کاروبار پر زیادہ زور دیا جاتا تھا۔ مقصد مجھے حالیہ معلومات سے ہم آہنگ کرنا تھا۔ اس کے بعد ایک فزپو تھراپسٹ مجھے کچھ مخصوص ورزشیں کراتا اور جسم کی مالش کرتا۔ ہاتھ پیروں کا کھردراؤ دور کرنے کے لیے لوشن استعمال کرتا۔ دوپہر کے کھانے کے بعد مجھے ایک گھنٹے آرام کا وقفہ دیا جاتا۔ اس کے بعد ایک گھنٹے کی سوئمنگ پھر ہلکی ورزش اور باڈی بلڈنگ۔ شام کو ایک بار پھر بھاپ سے غسل اور اس کے بعد میں اور ماہ روز تفریح کے لیے نکل جاتے تھے۔ دو گھنٹے کسی تفریح گاہ میں گزار کر جب میں واپس آتا تو ذہنی طور پر بے حد تروتازہ ہوتا۔ اس کے بعد میں اپنے کام میں لگ جاتا۔ پہلے سے جمع شدہ معلومات کا جائزہ لیتا۔ فوٹس بناتا اور جن باتوں کی کمی محسوس کرتا، ان کی آغا سے فرمائش کر دیتا۔ رات ٹھیک نو بجے بستر پر چلا جاتا اور سو جاتا۔

دو ہفتے بعد میں ایک مکمل تبدیل شدہ شخص تھا۔ چہرے پر رونق اور تازگی آگئی تھی اور رنگت نکھر گئی تھی۔ جسم کسی قدر بھر گیا تھا اور ہاتھ ایسے نرم اور ملائم ہو گئے تھے جیسے کہ کسی بزنس مین کے ہونے چاہئیں۔ میرے بال جدید انداز میں تراشے گئے تھے اور میں اپنی عمر سے پانچ سال کم نظر آتا تھا۔ اس دوران میں آغا میرے لیے بیک گراؤنڈ تیار کرتا

میں اور ماہ روز جب دروازے کے قریب پہنچے تو وہاں موجود گارڈز نے ہمارا بغور معائنہ کیا مگر اندر جانے سے نہیں روکا۔ داخلی دروازے کے عین اوپر ایک چھوٹا سا چوکور کمرہ بنا ہوا تھا۔ اس میں کئی سوراخ تھے اور میرے خیال میں اصل گارڈز وہیں تھے۔ چھ منزلہ عمارت کی پہلی منزل ایک بڑے ہال پر مشتمل تھی۔ یہ کسٹمر سروس ایریا تھا۔ ہال کے دائیں بائیں قطاروں میں میزیں لگی تھیں۔ کیش کاؤنٹر دائیں جانب تھا۔ داخلی دروازے کے فوراً بعد استقبال کاؤنٹر تھا۔ جس پر ایک حسین لڑکی کمپیوٹر سے نبرد آزما تھی۔ ہمیں دیکھ کر اس کے ہاتھ رک گئے۔

”اپنی سروس سر اینڈ میڈم۔“
”ہمیں سیف روم میں کچھ قیمتی اشیاء محفوظ کروانی ہیں۔“ میں نے دھیمے لہجے میں اپنی آمد کی وجہ بتائی۔
”موسٹ ویلکم سر اینڈ میڈم۔“ اس نے اپنے موتیوں جیسے دانتوں کی نمائش کی ”آپ لیفٹ رو میں تھرڈ ٹیبل پر چلے جائیں۔ وہاں آپ کو اے اے ستار ملیں گے۔ وہ کسٹمر سروس کے انچارج ہیں۔“

اس کا شکریہ ادا کر کے میں اور ماہ روز بائیں قطار کی تیسری میز کی طرف بڑھے۔ جس پر بیٹھے ہوئے شخص نے سرمئی سوٹ پہن رکھا تھا۔ اس کی عمر تقریباً چالیس سال تھی اور وہ فارغ البال ہو رہا تھا۔ چہرے سے خاصا تیز طرار لگ رہا تھا۔ اس نے اٹھ کر ہمارا استقبال کیا۔ خادم کو عظمت اللہ ستار کہتے ہیں۔“

”اقبال احسن۔“ میں نے اپنا وزیٹنگ کارڈ اس کی طرف بڑھایا۔ جو متاثر کن تھا۔ میرے پاس اس نام کی مکمل دستاویزات اور کئی کریڈٹ کارڈ تھے۔ اس کے علاوہ شہر کے ایک مصروف بزنس ایریا میں میرا آفس بھی تھا۔ کارڈ کے مطابق میں امپورٹر اور ایکس پورٹر تھا۔ ”مسز اقبال ہیں۔“ میں نے ماہ روز کا تعارف کرایا۔ اس کے چہرے پر ہلکی سی سرخی لہرائی۔

”تشریف رکھئے۔ آپ کیا پسند فرمائیں گے۔ ٹھنڈا یا گرم۔“

”میرا خیال ہے موسم کی مناسبت سے کافی چلے گی۔“ میں نے مسکرا کر کہا۔

میری بے تکلفی پر وہ کھل اٹھا۔ اس نے انٹرکام اٹھا کر کسی سے کافی لانے کو کہا پھر مجھ سے کہا ”جی فرمائیے“ میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں۔“

ہے۔" ماہ روز نے شکایت کرنے کے انداز میں کہا "اب دیکھیں، گھر میں دو گارڈز ہیں۔ ہمارا سیف جدید قسم کا ہے۔ اس کے باوجود ڈاکو گھس آئے تھے۔ اگر ہماری قسمت اچھی نہ ہوتی تو ہم لٹ ہی گئے ہوتے۔"

"اقبال صاحب، آپ شاید بیگم صاحبہ سے متفق نہیں ہیں۔" اے اے ستار نے مجھ سے کہا۔

"بھائی، ہم کیا کہیں، ہم تو پہلے ہی لٹ گئے تھے۔" میں نے ماہ روز کی طرف دیکھ کر کہا "ہماری تو قسمت بھی کام نہیں آئی۔"

"آپ تو بس... ہر ایک کے سامنے شروع ہو جاتے ہیں۔" اس نے شرما کر کہا "میں یقین سے نہیں کہہ سکتا کہ یہ اداکاری تھی یا وہ سچ مچ شرما رہی تھی۔ پچھلے کچھ دنوں سے ہمارے درمیان ایک غیر محسوس تعلق پرورش پا رہا تھا۔

"میں نے بینکاری کا یہ انداز صرف یورپ اور امریکا میں دیکھا تھا۔" میں نے ہال کا جائزہ لیا "مجھے اندازہ نہیں تھا کہ یہ سسٹم اب ہمارے ہاں بھی رائج ہو چکا ہے۔" "اپنے کسٹمرز کے مفادات کا ہم مکمل خیال رکھتے ہیں اور انہیں ہر ممکن سہولت فراہم کرتے ہیں۔" وہ فخر سے بولا۔

"مجھے اندازہ ہے ویسے آپ اپنے سیف روم میں کیا سہولیات دیتے ہیں۔"

"ہم آپ کو ہر سائز کا لاکر دے سکتے ہیں۔ بقول شخصے آپ سوئی سے لے کر ہاتھی تک جو چاہیں ہمارے سیف روم میں رکھوا سکتے ہیں۔ خیر یہ تو مبالغہ آرائی ہے مگر ہماری گنجائش عام بینک لاکروں سے کہیں زیادہ اور اس کے مقابلے میں ہر لحاظ سے محفوظ ہے۔ سیف روم حاصل کرنے کے دو طریقے ہیں۔ پہلا انشورنس کے ساتھ، دوسرا انشورنس کے بغیر۔ ویسے لوگ عام طور پر بغیر انشورنس والے طریقے کو ترجیح دیتے ہیں کیونکہ ہمارا سیف روم سو فیصد فول پروف ہے اور یہاں چوری کا کوئی امکان نہیں ہے۔"

"دونوں طرح کے طریقوں میں کیا فرق ہے؟"

"انشورنس کرانے کی صورت میں ہم اپنی فیس میں پریمیم بھی شامل کر لیتے ہیں۔ جو عام انشورنس کمپنیوں سے تمہیں کم ہوتا ہے اور نقصان ہونے کی صورت میں ہم مکمل ادائیگی کے پابند ہیں۔ یہ ادائیگی ہم دنیا کی کسی بھی کرنسی کی شکل میں کر سکتے ہیں۔ ہاں کوئی قیمتی چیز اگر پہلے سے انشورڈ ہو تو ہم کمپنی سے رابطہ کر کے اس سے معاہدہ کر لیتے ہیں اور جب تک چیز ہمارے پاس رہتی ہے، اس کی دس فیصد دیتے

رہا۔ اس نے مجھے مطلوبہ معلومات بھی فراہم کر دی تھیں۔ جن میں سب سے اہم بینک کا اندرونی نقشہ اور وہاں کے حفاظتی انتظامات کی تفصیل تھی۔ اس کے مطابق جب تک بینک میں کام ہو رہا تھا۔ گارڈز کی تعداد آٹھ رہتی تھی۔ جن میں دو باہر اور چھ اندر کے گارڈز ہوتے تھے۔ اندرونی گارڈز میں سے ایک داخلی دروازے کے اوپر مورچے میں رہتا تھا۔ جہاں سے وہ اندرونی ہال اور باہر دونوں طرف نظر رکھ سکتا تھا۔ ہال میں کوئی گارڈ نہیں ہوتا تھا۔ اس کے بعد ہر منزل پر ایک گارڈ ہوتا تھا۔ آخری گارڈ سیف روم میں ہوتا۔

شام چھ بجے ڈیوٹی آف ہونے کے بعد بینک بند کر دیا جاتا۔ آخری پانچ منزلیں لاک کر دی جاتیں۔ البتہ داخلی ہال کی چابی رات کے پیریداروں کے پاس ہوتی تھی۔ شام چھ سے رات دو بجے تک دو پیریداروں کی جوڑی بینک کے باہر موجود رہتی تھی۔ رات دو بجے کے بعد دوسرے گارڈز آ جاتے تھے۔ جو صبح نو بجے تک موجود رہتے تھے۔ دوسری منزل پر عقبی حصے میں ایک مرکزی کنٹرول روم تھا۔ بینک کے داخلی ہال میں چار کیمرے تھے اور ہر منزل کی راہداری میں مووی کیمرے موجود تھے۔ یہ کنٹرول روم میں موجودی وی اسکریمنوں پر مسلسل ہال اور راہداری کے مناظر دکھاتے رہتے تھے۔ کوئی شخص کیمروں کی زد میں آئے بغیر ہال میں داخل نہیں ہو سکتا تھا۔ جیسے ہی تمام افراد بینک کی عمارت خالی کرتے تھے، داخلی ہال میں نظر نہ آنے والی شعاعوں کا جال بچھا دیا جاتا تھا۔ جیسے ہی کوئی شخص یا چیز ان شعاعوں کی زد میں آتی تھی۔ عمارت اور ضلعی پولیس ہیڈ کوارٹر میں سائرن بجنے لگتا تھا اور پولیس فوراً بینک کی طرف دوڑ پڑتی۔ بلاشبہ یہ انتظامات ایسے تھے کہ سیف روم تک پہنچنا تو ایک طرف رہا صرف داخلی ہال میں گھسنا ہی بہت بڑا مسئلہ تھا۔ ڈاکو بجلی بند کر کے بھی کچھ نہیں کر سکتے تھے کیونکہ اس صورت میں سیف روم تک جانے والی لفٹ بے کار ہو جاتی اور پھر بینک کا اپنا جزیئر پلانٹ تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ یہ معلومات بے حد عمومی نوعیت کی تھیں اور ایک کامیاب پلاننگ کے لیے ضروری تھا کہ میں خود بینک جاؤں اور وہاں کے انتظامات کا جائزہ لوں۔ لہذا میں اور ماہ روز اس وقت بینک میں موجود تھے۔ جب تک کافی آتی، ماہ روز، اے اے ستار کو اس ڈاکے کی تفصیل سناتی رہی جس میں ڈاکوؤں نے ہمیں لوٹنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔ وہ تو اتفاق ہے پولیس موبائل وہاں آنکلی اور ڈاکو بدحواسی میں فرار ہو گئے۔

"امن وامان کی صورت حال آئے دن خراب ہو رہی

”لفٹ کے بجائے دروازے میں کرنٹ آجاتا۔“ اے اے ستار نے کہا۔ میں نے دیکھا کہ وہ ماہ روز سے سخت متاثر نظر آ رہا تھا۔ لفٹ کا دروازہ کھلا۔ ہم اندر آ گئے اور چند سیکنڈ میں ہم چھٹے فلور پر تھے۔ لفٹ سے ہم ایک چوکور کمرے میں آئے۔ جس کے دائیں جانب لفٹ تھی۔ اس کے دائیں طرف کی دیوار میں ایک عظیم الشان آہنی دروازہ لگا ہوا تھا۔ اس پر دو ڈائل اور ایک گول ہینڈل تھا۔ یہ دروازہ گولائی میں دو میٹر قطر کا تھا۔

”یہ ہے ہمارے سیف روم کا دروازہ۔“ اے اے ستار فخریہ انداز میں بولا ”اس فولادی دروازے کی موٹائی ایک میٹر ہے اور اسے دو ڈائل کی مدد سے کھولا جاتا ہے۔ ایک کانبر میں سیٹ کرتا ہوں اور دوسرے کا مسٹر رابرٹ۔“ اس نے گورے کی طرف دیکھا ”ہم روزانہ ایک نیا کمبیشن لاک ترتیب دیتے ہیں اور ہم ایک دوسرے کی ترتیب سے بے خبر رہتے ہیں۔ گویا اگر کوئی مجھے گن پوائنٹ پر یہاں لے آئے تو بھی اس دروازے کو نہیں کھولا سکتا۔ آپ ذرا سائڈ میں ہو جائیں تو ہم دروازہ کھول دیں۔“

میں اور ماہ روز ایک طرف ہو گئے۔ مسٹر رابرٹ بھی ہمارے ساتھ تھے۔ کچھ دیر بعد جب اے اے ستار نے اپنا نمبر ڈائل کر لیا تو رابرٹ گیا اور اس نے نمبر ڈائل کیا۔ اس کے بعد اس..... نے چکر دار ہینڈل گھمایا اور کم از کم چھ ٹن وزنی یہ دروازہ بے آواز طریقے سے کھلنے لگا۔ اس کے دوسری طرف متاثر کن منظر تھا۔ ایک لائن میں ایسے ہی چار اور دروازے خود بہ خود کھل رہے تھے۔ اے اے ستار کہہ رہا تھا۔ اس ترتیب میں ایک خوبی ہے۔ اگر آپ نے لاک کمبیشن غلط ڈائل کیا تو نیچے ہال میں الارم بجنے لگے گا اور اندر کے باقی چار دروازے خود بہ خود جام ہو جائیں گے اور پھر انہیں کمپنی کے ماہر ہی آکر کھول سکیں گے۔ جنہوں نے سیف روم بنایا ہے۔“

ہم نے اندر قدم رکھا۔ ماہ روز ایک ایک چیز پر حیرت کی انتہا کئے دے رہی تھی اور میں ایسے شخص کا کردار ادا کر رہا تھا جسے اس سسٹم نے متاثر ضرور کیا تھا لیکن اسے ان سب سے زیادہ دلچسپی نہیں تھی۔ ماہ روز اپنا کردار بہ خوبی نبھا رہی تھی اور میں دیکھ رہا تھا کہ اس کی اداؤں نے کم از کم اے اے ستار کی عقل کو گھاس چرنے ضرور بھیج دیا تھا۔ وہ اس کے سوالوں پر فرفر تفصیلات بتا رہا تھا۔ دروازوں سے گزر کر ہم ایک وسیع و عریض ہشت پہلو کمرے میں پہنچے۔ یہ مکمل طور پر فولادی چادر سے تیار کیا ہوا تھا۔ آپ اسے ایک بہت

واری ہم پر عائد ہوگی۔ دوسری صورت میں ہم صرف لاکر کی خدمت مہیا کریں گے۔ اگر آپ چاہیں تو رکھی جانے والی چیز ہمیں بھی نہ دکھائیں۔ آپ خود اسے لاکر میں رکھنے اور نکالنے کے مجاز ہوں گے۔“

”کیا آپ ہمیں اپنا سیف روم دکھا سکتے ہیں؟“ ماہ روز نے پُراشتیاق لہجے میں کہا۔

”کیوں نہیں، ہم چاہتے ہیں کہ آپ خود دیکھ کر ہم پر اعتماد کریں۔“ اس نے کہا ”ایک منٹ میں ابھی آیا۔“

وہ انھہ کر ایک کونے میں لگے فون تک گیا۔ اس نے کسی سے بات کی اور واپس آگیا۔ آپ کو دو منٹ انتظار کی زحمت اٹھانی پڑے گی۔“ اس نے معذرت خواہانہ انداز میں کہا۔ کچھ دیر بعد ایک لفٹ کھلی اور اسی میں سے ایک غیر ملکی برآمد ہو کر سیدھا ان کی طرف آیا۔ اس نے گرم جوشی سے مجھ سے اور ماہ روز سے مصافحہ کیا۔ اس کے منہ سے سگار اٹکا ہوا تھا اور بال سلیقے سے جتے ہوئے تھے۔ رسمی جملوں کے بعد اس نے جیب سے دو عجیب وضع کی چیزیں نکالیں۔ یہ دو انچ لمبی اور گول تھیں اور ان کا اگلا حصہ ہک نما تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ دونوں ہکوں میں سائز کا معمولی سا فرق ہے۔ اس نے ایک ہک اے اے ستار کو پکڑا دیا۔ اس نے ہم سے کہا۔

”اب آپ دیکھیں گے کہ ہم نے کتنی سخت سیکیورٹی رکھی ہے۔“

ہم قدرے کونے میں لگی لفٹ کی طرف بڑھے جو براہ راست سیف روم تک جاتی تھی۔ اس نے اور اس کے غیر ملکی ساتھی نے اپنے ہک لفٹ کے دائیں بائیں موجود سوراخوں میں داخل کئے۔ فوراً لفٹ کے اوپر لگی نمبر پلیٹ روشن ہو گئی اور اس پر ہندسے تیزی سے بدلنے لگے۔ میں نے محسوس کیا کہ ماہ روز ہم سے کچھ قدم پیچھے ہٹ گئی تھی۔ میری نگاہ اب ہندسوں پر تھی۔ وہ ترتیب سے نہیں بدل رہے تھے۔ یہاں پانچ عدد تھے۔ اگر پہلے خانے میں ایک نمبر آتا تو دوسرے میں دو، تیسرے میں تین، چوتھے میں چار اور پانچویں میں پانچ آتا۔ اسی طرح اگلی ترتیب دو تین چار پانچ چھ ہوتی اور اس سے اگلی ترتیب تین چار پانچ چھ سات ہوتی، تمام نمبر بیک وقت بدل رہے تھے جیسے ہی پہلے خانے میں چار نمبر آیا۔ دونوں نے بیک وقت ہک باچائیاں گھمائیں۔ ہلکی سی کلک کی آواز آئی لفٹ نیچے آنے لگی۔

”زبردست۔“ ماہ روز نے خوش ہو کر کہا ”ویسے اگر آپ دونوں بیک وقت چابی نہ گھماتے تو کیا ہوتا؟“

”اوہ میرا مقصد یہ نہیں تھا۔“ ماہ روز نے ہدایت سے کہا ”اگر آپ نے برا محسوس کیا تو آئی ایم سوری۔“

”ہرگز نہیں۔“ اے اے ستار جلدی سے بولا۔ غالباً اسے یاد آگیا تھا کہ ہم اس کے متوقع کسٹمر تھے اور اسے کسٹمر آل ویز رائٹ کے اصول پر عمل کرنا چاہیے تھا۔ ہمیں آپ کو مطمئن کر کے دلی خوشی ہوگی۔ ہماری ڈیوٹی یہی ہے۔“

”اگر فرض کریں کوئی شخص آپ کے تمام تر حفاظتی انتظامات کے باوجود یہاں پہنچ جائے تو؟“

”تب بھی یہاں سے باہر نہیں جاسکے گا۔“ اے اے ستار فاتحانہ انداز میں بولا ”ہم نے یہاں ایسا سٹم کر رکھا ہے کہ آنے والا اگر دس منٹ سے زیادہ یہاں رہے تو اوپر سے خود بہ خود ایک جنگلا نیچے گرے گا اور وہ اس میں قید ہو جائے گا۔“

اس کے الفاظ ابھی منہ ہی میں تھے کہ دروازے کے عین سامنے چھت سے لوہے کی مضبوط سلاخوں والا جنگلا نیچے گرا۔ ہم اس میں قید ہو کر رہ گئے تھے۔ غالباً دس منٹ پورے ہو گئے تھے۔ اے اے ستار نے ہنستے ہوئے کہا ”میڈم“ آپ نے خود ملاحظہ فرمالیا۔ اب اگر یہاں کوئی آ بھی جاتا ہے تو اسے لاکرز کھولنے یا توڑنے کے لیے کم از کم دس پندرہ منٹ تو درکار ہوں گے۔“

”اس دوران میں یہ جنگلا گر چکا ہوگا۔“

”مگر ہم باہر کیسے جائیں گے۔“ اس دفعہ ماہ روز سچ مچ پریشان تھی۔

”کوئی مسئلہ نہیں ہے۔“ اے اے ستار نے کہا اور باہر کمرے میں موجود واحد گارڈ کو آواز دے کر جنگلا کھولنے کو کہا۔ چند لمحے بعد جنگلا خود بہ خود اوپر اٹھ کر چھت میں غائب ہو گیا۔

”حیرت انگیز“ میں نے ستائشی لہجے میں کہا۔ ”ان انتظامات کی موجودگی میں یہاں چوری کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا ہے۔“

”بس ہم یہیں لاکر لیں گے۔“ ماہ روز نے گویا فیصلہ کر دیا۔

اس نے لاکر منتخب کیا جس کا کرایہ سن کر ہی ایک آدمی عام کے ہوش اڑ جاتے۔ یہ کرایہ سالانہ نہیں بلکہ ماہانہ تھا۔ نیچے جاتے ہوئے اے اے ستار نے انکشاف کیا کہ ان کے لاکرز ہفتے وار بلکہ گھنٹوں کے حساب سے بھی دستیاب ہوتے ہیں۔ نیچے آکر ہم نے لاکر کے فارم بھرے۔ میں نے کریڈٹ کارڈ کی

بڑی تجوری کہہ سکتے ہیں۔ کمرے میں دیواروں کے ساتھ دس بارہ فٹ لمبے فولڈنگ ٹریک تھے جن میں لاکرز نصب تھے۔ یہ لاکرز ہر سائز کے تھے۔ ایک چوٹی سی دراز سے لے کر ایک بڑی تجوری کے سائز تک کے۔ ایک کونے میں زمین سے دس فٹ اونچی تجوری نصب تھی۔

”میڈم کیسا لگا آپ کو ہمارا سیف روم۔“

”شانداز۔“ ماہ روز پرجوش انداز میں بولی ”یہاں تو چڑیا کا بچہ بھی نہیں آسکتا۔“

”یہ ہمارے لاکرز ہیں۔ جن لاکرز پر آپ نیلے اسٹیکر دیکھ رہے ہیں۔ یہ دستیاب ہیں۔“

ماہ روز قریب جا کر لاکرز کا معائنہ کر رہی تھی۔ اس نے معصومیت سے کہا ”یہ لاکرز میں دولٹ کیوں ہیں؟“

اے اے ستار اس معصومیت پر قریان ہوتے ہوتے بچا۔ ”میڈم“ دراصل ہر لاکر کی دو چابیاں ہوتی ہیں جب تک دونوں نہ لگیں لاکر نہیں کھلے گا۔ ایک چابی آپ کے پاس ہوگی اور دوسری چابی ہمارے پاس۔“

”آپ کیسے پہچانے گے کہ یہ چابی ہمارے لاکر کی ہے؟“

”یہ دیکھیں“ ہر لاکر پر نمبر لکھا ہے۔ یہی نمبر چابیوں کے کیگ پر ہوگا۔“

”اور اگر ہماری چابی کھو گئی تو؟“ اس دفعہ ماہ روز نے پریشانی سے کہا۔

”آپ قطعی فکر نہ کریں۔ ہمارے پاس اس کا بھی حل ہے۔ ہم نے ہر چابی کی ڈپلیکیٹ تیار کر رکھی ہے۔ اگر آپ کی چابی کھو جائے تو ہم اس کی مدد سے آپ کو لاکر کھول کر دے سکتے ہیں مگر اس کے بعد لاکر کے دونوں ٹالے تبدیل کر دیے جائیں گے اور اس کا خرچہ آپ کو برداشت کرنا پڑے گا۔“

”یعنی آپ کے پاس دوسری چابی بھی ہوگی۔“ ماہ روز کی پریشانی بڑھ گئی ”آپ چاہیں تو اس کی مدد سے میری غیر موجودگی میں بھی لاکر کھول سکتے ہیں۔“

یہ بات اے اے ستار کو زیادہ پسند نہیں آئی۔ ”میڈم ہمارا کام ہی اعتماد کی بنیاد پر چلتا ہے اور گزشتہ دو سال کے عرصے میں کوئی ایک شکایت بھی نہیں آئی ہے پھر آپ کی تسلی کے لیے بتا دوں کہ اضافی چابیوں کا سیٹ اسی تجوری میں ہے۔“ اس نے دس فٹ اونچی تجوری کی طرف اشارہ کیا۔

”اور یہ تجوری صرف ہمارے ایم ڈی صاحب ہی کھول سکتے ہیں۔ لہذا وہی لاکرز بھی کھول سکتے ہیں لیکن وہ ہم دونوں کے بغیر یہاں نہیں آسکتے اور جب بھی آتے ہیں ہمارے ساتھ ہی آتے ہیں۔“

بولاً ”ان کپوں میں چائے پی سکوگی۔ یہ تمہارے اسٹینڈرڈ کے تو نہیں ہیں۔“

لڑکے نے دانت نکالے ”صاحب، آپ کپوں کا اسٹینڈرڈ مت دیکھو۔ آپ چائے کا اسٹینڈرڈ دیکھو۔“

اس نے ہمیں چائے کے کپ تھما دیے۔ چائے واقعی بہت اچھی تھی۔ ماہ روز جو کپ دیکھ کر منہ بنا رہی تھی۔ اب چائے سے لطف لے رہی تھی۔

”اسے بھی خوشی کہتے ہیں۔“ میں نے اس کی طرف جھک کر کہا۔

شام کو جب ہم واپس آنا پیلس جا رہے تھے، اچانک ماہ روز نے میرے شانے پر سر رکھ دیا۔ ”جمانگیر میں اس جہنم سے نکلنا چاہتی ہوں۔ میں خوش ہونا چاہتی ہوں۔“



آغا نے تلخ لہجے میں کہا ”اب تک تم نے کیا کیا ہے؟“ ”کچھ نہیں۔“ میں نے بھی خشک لہجے میں کہا ”یہ کام بہت مشکل ہے۔ سیف روم تک پہنچنا تقریباً ناممکن ہے اور مجھے اس ناممکن کو ممکن بنانا ہے۔ اس میں کچھ وقت تو لگے گا۔“

”لیکن ہمارے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔“ وہ بولا ”اگر تاخیر کی وجہ سے ہم کسی پریشانی کا شکار ہوئے تو تم بھی اس میں برابر کے شریک ہو گے۔“

”اگر تم مجھے اسی طرح تنگ کرتے رہے تو تاخیر تو ہو سکتی ہے لیکن کسی جلدی کا امکان نہیں رہے گا۔ میں نے تم سے پہلے بھی کہا تھا مجھے فری ہینڈ دے دو۔ مجھے بھی تمہاری پریشانیوں کا اندازہ ہے مگر براہ کرم ان کا بار بار ذکر کر کے مجھے پریشان مت کرو۔“

غالباً آغا کو بھی احساس ہو گیا تھا کہ میں اس کی کامیابی کی کنجی ہوں اور مجھے تنگ کر کے وہ کامیابی حاصل نہیں کر سکے گا لہذا اس نے فوراً گرگٹ کی طرح رنگ بدلا ”سوری جمانگیر“ میرا مقصد تمہیں پریشان کرنا نہیں تھا۔ اب میں تمہارے کام میں مداخلت نہیں کروں گا لیکن تم جس قدر جلد ممکن ہو، اس منصوبے کو مکمل کرو۔“

میں مسکرا دیا، کیسے کیسے فرعون جو ناک پر مکھی نہیں بیٹھنے دیتے، اپنی غرض سے کسی کے قدموں میں لوٹنے کے لیے بھی تیار ہو جاتے ہیں۔ اس رات میں حسب معمول سونے کے لیے لیٹا تو مجھے ماہ روز اور حنا کے مننے کی آواز آئی۔ حنا، ماہ روز کے ساتھ تیسری منزل پر رہتی تھی اور مجھے وہاں جانے کی اجازت نہیں تھی۔ حنا مجھ سے ملنے نیچے آتی تھی اور جب

مدد سے لاکر فیس کی ادائیگی کی۔ میرے کارڈ کو دیکھ کر وہ واضح طور پر متاثر نظر آنے لگا۔ اس نے مجھے چابی لا کر دی۔ ”امید ہے آپ ہماری سروس کو سب سے بہتر پائیں گے۔“ اے اے ستار نے کہا تھا۔

”یقیناً۔“ میں نے اس سے ہاتھ ملایا ”اور دل میں مسکرایا ”اگر اسے ہمارے ارادوں کی بھنک پڑ جاتی تو شاید وہ حیرت سے بے ہوش ہو جاتا۔ واپسی پر ہم نے ایک ہوٹل میں لیج کیا۔ اس روز ماہ روز بہت خوش نظر آ رہی تھی۔

”تم اس زندگی سے خوش ہو؟“ میں نے اچانک پوچھا۔ وہ کسی بات پر ہنس رہی تھی یک دم سنجیدہ ہو گئی ”خوشی سے تمہاری کیا مراد ہے۔ اگر دولت، آسائشوں، اچھا کھانے اور پہننے کو خوشی کہتے ہو تو میں بہت خوش ہوں۔“

”جس نے بھی تمہیں خوشی کا یہ مطلب بتایا ہے، اس نے جھوٹ بولا ہے۔ خوشی وہ جذبہ ہے جو انسان کے اندر سے ابھرتا ہے۔ یہ مادی آسائشوں سے بے نیاز ہے۔ میں نے ایسے لوگوں کو بھی خوش اور زندگی سے پوری طرح مطمئن دیکھا ہے جن کے تن پر پورے کپڑے بھی نہیں ہوتے ہیں۔“

”تب پھر تمہارا خوشی سے کیا مطلب ہے؟“ میں نے گہری سانس لے کر اس کا ہاتھ تھام لیا ”تمہیں میرا ہاتھ پکڑنا کیسا لگا۔“

اس کے چہرے پر سرخی دوڑ گئی ”پلیز، ہاتھ چھوڑو لوگ دیکھ رہے ہیں۔“ وہ جھینپ کر بولی۔

”نہیں پہلے میرے سوال کا جواب دو۔ اگر اچھا لگا ہے تو بتا دو اور اگر بُرا لگا ہے تو تب بھی بے دھڑک کہہ دو۔“

”اچھا۔ اچھا لگا۔“ ”بس یہی خوشی ہے۔ جو بغیر روپے پیسے کے صرف کسی کے چھونے سے مل جاتی ہے۔“

کھانے کے بعد ہم ساحل سمندر کی طرف گئے۔ عام دن ہونے کی وجہ سے وہاں جھوم نہ ہونے کے برابر تھا۔ میں نے اپنے جوتے اتارے۔ کوٹ اتار، ٹائی ڈھیلی کی، پتلون کے پائینچے چڑھائے۔ ماہ روز نے اپنے سینڈل ہاتھ میں تھام لیے۔ ہم تھروں میں چل قدمی کرنے لگے۔ ہلکا سا ٹھنڈا پانی آتا اور ہمارے پیروں کو گدگدا کر چلا جاتا۔ تھوڑی دیر بعد ماہ روز کو سردی لگنے لگی لہذا ہم پانی سے نکل کر ایک چٹان پر بیٹھے جو صرف دھوپ سے فرحت بخش حد تک گرم ہو رہی تھی۔ اسی اثنا میں ایک لڑکا کیتلی اور کپ سنبھالے چلا آیا۔ ”صاحب گرم گرم چائے، صرف پانچ روپے کا کپ۔“ ”دو کپ دے دو۔“ میں نے اس سے کہا پھر ماہ روز سے۔

جان بھی بچا سکتا تھا۔



اگلی صبح میں ناشتے سے فارغ ہو کر سو ٹمنگ پول اور ورزش کرنے کے بجائے بینک کی عمارت کا نقشہ لے کر بیٹھ گیا۔ آغا نے میری فرمائش پر اس عمارت میں کی گئی وارننگ میں اضافہ بھی کر دیا تھا۔ اس کے مطابق بینک کا سوچ روم گراؤنڈ فلور پر مرکزی ہال کے عقب میں تھا۔ یہ جگہ زیادہ واش روم، اسٹور اور پکن جیسی جگہوں کے لیے مخصوص تھی۔ سوچ روم وہ جگہ تھی جہاں سے عمارت کے ہر قسم کے پوائنٹ گزرتے تھے۔ یعنی بجلی، فون، انٹرکام، الارم اور ٹیکمرے کے کیبلز وغیرہ۔ میں نے طے کر لیا تھا کہ ہمارا پہلا ہدف یہی سوچ روم ہو گا۔ یہ بات بھی طے تھی کہ واردات رات کو ہوگی۔ بارہ بجے کے بعد۔

بینک کی عمارت کے ارد گرد بھی کاروباری نوعیت کی عمارتیں تھیں۔ البتہ بینک کی عمارت ان سے الگ تھلگ تھی۔ یعنی اس کے چاروں طرف سڑکیں اور گلیاں تھیں بائیں طرف کی گلی رات کے وقت گاڑیاں پارک کرنے کے کام آتی تھی اور اسی گلی میں وہ دروازہ کھلتا تھا جہاں سے صفائی کرنے والے صبح بینک کی عمارت میں داخل ہوتے تھے۔ اس دروازے کی چابیاں صبح والے گارڈز کے پاس ہوتی تھیں۔ صفائی کا کام ان کی نگرانی میں ہوتا تھا۔ اس وقت ہال کا حفاظتی نظام بند کر دیا جاتا تھا۔ دیکھا جائے تو یہ واردات کے لیے مثالی وقت تھا مگر اس میں زیادہ مہلت نہ ملتی۔ ساڑھے آٹھ بجے صفائی والے آتے تھے اور اس کے نصف گھنٹے بعد بینک ملازمین آنا شروع ہو جاتے۔ گویا آدھے گھنٹے کی مہلت تھی جب کہ میرے خیال میں سیف روم تک جانے اور وہاں سے مال سمیٹ کر لانے کے لیے کم از کم دو گھنٹے درکار تھے۔ وہاں ایک ہزار سے زائد لاکرز تھے اور ان میں سے نصف الاٹ تھے۔ بڑی تجوری سے ان کی چابیاں نکالنا اور باری باری ان کو کھنگالنے میں خاصا وقت لگتا۔ آغا کے تخمینے کے مطابق وہاں پانچ کروڑ کی کرنسی اور قیمتی اشیاء تھیں جب کہ میرے اندازے کے مطابق وہاں اس سے کئی گنا زیادہ مالیت کی کرنسی اور قیمتی سامان تھا لیکن میں نے آغا پر اپنا یہ خیال ظاہر نہیں کیا۔ اگر ہم کامیاب ہو جاتے تو بینکوں کی تاریخ میں سب سے بڑی ڈکیتی ہوتی۔

رات کو سیکورٹی کا نظام کچھ یوں تھا کہ باہر کے دو گارڈز کے علاوہ دو سری منزل کے کنٹرول روم میں دو افراد ہمہ وقت ٹی وی اسکرینوں کے سامنے موجود رہتے تھے۔ یہاں سے وہ

اس کی زبان پر ماہ روز کا نام ہوتا۔ ”روزی آئی نے میرے ساتھ فٹ بال کھیلا، انہوں نے میری پونی ٹیل باندھی، روزی آئی نے مجھے کیرم سکھایا۔ روزی آئی نے مجھے کہانی سنائی۔“ وہ اس سے اتنی زیادہ مانوس ہو گئی تھی کہ اب میری بھی زیادہ پروا نہیں کرتی تھی اور یہاں آنے کے بعد سے میں نے اس کے منہ سے ماں کا ذکر نہیں سنا تھا۔ مجھے بہ خوبی اندازہ تھا کہ شبنم جیسی عورت نے اپنی بیٹی کو کتنی ”محبت“ دی ہوگی۔ یہ اس کا منطقی نتیجہ تھا کہ اب حنا کو اس کی یاد نہیں آتی تھی۔ میں نے اٹھ کر کھڑکی سے دیکھا۔ حنا اور ماہ روز باغ میں جلتے فمغموں کی روشنی میں فٹ بال کھیل رہی تھیں۔ ماہ روز بڑی مہارت سے اسے ڈاج دے رہی تھی لیکن ایک بار حنا کو موقع ملا۔ اس نے لگ مارنے کے بجائے فٹ بال اٹھائی اور لے جا کے ماہ روز کے گول میں پھینک دی۔

”یہ فاول ہے۔“ ماہ روز چیخی۔

”جی نہیں۔ یہ فاول نہیں ہے۔ آپ اتنی بڑی ہیں۔“ حنا نے کہا۔ مجھے اس کی ذہانت نے حیران کر دیا۔ اس نے کتنی صفائی سے واضح کیا تھا کہ کھیل میں توازن نہیں تھا لہذا وہ فاول پلے کا حق رکھتی تھی۔ اس چیز نے میرے ذہن میں کئی درتچے کھول دیے۔ میں سوچنے لگا تھا کہ کمزور کو حق ہوتا ہے، وہ اپنے تحفظ کے لیے طاقت ور کے خلاف بے ایمانی سے بھی کام لے سکتا ہے۔ شیر اور شکاری میں طاقت کا توازن نہیں ہوتا لہذا اس کھیل میں بدوق کو شامل کر کے یہ توازن حاصل کر لیا جاتا ہے۔ مجھے بھی توازن کی ضرورت تھی اور اس کے لیے مجھے وہ فاول پلے کھیلنا تھا۔ مجھے شدت سے احساس ہونے لگا کہ میں آغا کے رحم و کرم پر تھا اور وہ ہر لحاظ سے مجھ پر حاوی تھا۔ میرا ذہن تیزی سے توازن کے حصول کا ذریعہ سوچ رہا تھا۔ مجھے ہر صورت آغا سے نجات حاصل کرنی تھی۔ میں اس پر بھروسہ نہیں کر سکتا تھا۔ مجھے اس کے منصوبے سے کوئی دلچسپی نہیں تھی اور میں یہ کام مارے باندھے کر رہا تھا۔ غالباً آغا کو بھی اس کا احساس تھا۔ اس وقت کیا ہوتا جب منصوبہ کامیاب ہو جاتا۔ اس وقت میں آغا کے لیے ایک غیر ضروری چیز بن جاتا جو نہ صرف اس کی کامیابی میں حصے دار ہوتا بلکہ اس کے لیے خطرہ ہوتا۔ اس کے لیے سب سے مناسب راستہ یہی تھا کہ مجھ سے نجات حاصل کرے۔ اچانک میرے ذہن میں ایک خیال یوں چمکا جیسے تاریک آسمان پر بجلی چمکتی ہے۔ میں بستر پر اچھل پڑا۔

”وہ مارا۔“ میں نے چلا کر کہا۔ مجھے توازن مل گیا تھا۔ اب میں نہ صرف آغا سے چھٹکارا حاصل کر سکتا تھا بلکہ اپنی

”گڈ۔“ اس نے معنی خیز انداز میں کہا ”مجھے امید ہے کہ تم سیف روم تک ہماری رہنمائی کر سکو گے۔“
 ”میں۔“ میں نے بظاہر حیرت سے کہا ”مگر میں کہاں اس کام میں شامل ہوں گا۔“

”اس دفعہ میں نے تھوڑی سی تبدیلی کی ہے۔ میرے خیال میں کسی بھی پلان پر سب سے بہتر عمل وہی کر سکتا ہے جس نے پلان بنایا ہو۔ اس دفعہ جو مشکلات درپیش ہیں، انہیں دیکھتے ہوئے تمہاری رہنمائی لازمی ہے۔“

”اگر یہ تمہارا فیصلہ ہے تو مجھے کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔“ میں نے بے پروائی سے کہا۔ مجھے ماہ روز پہلے ہی بتا چکی تھی کہ آغا اس مہم کے لیے مجھے بھی لے جانے کا فیصلہ کر چکا ہے۔ اس لیے نہیں کہ میں بہتر رہنمائی کر سکوں گا بلکہ اس لیے کہ اب میں پکڑے جانے کے خیال سے کسی ناقص منصوبے پر عمل نہیں کروں گا اور یہ ایک حد تک درست تھا۔ میں نے آغا کو ابتدائی منصوبے سے آگاہ کیا۔
 ”ہم نصف رات کے بعد اپنی کارروائی شروع کریں گے۔“

آغا اس وقت ام الحناث سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔ اس نے بھویں سکپٹر کر کہا ”وہ کیوں۔“
 ”کیونکہ اس وقت شام کے گارڈز ڈیوٹی دے کر تھک چکے ہوں گے اور ان کے سر پر گھر جانے کی دھن سوار ہوگی۔ ہم ان کی سستی کا فائدہ اٹھائیں گے۔“

”یعنی انہیں راستے سے ہٹا دیں گے۔“ آغا بولا۔
 میں اس وقت اپنا سر پیٹ کر رہ گیا ”یہ میں پہلے ہی واضح کر چکا ہوں کہ ہم نے اس منصوبے کے دوران میں حفاظت پر مامور کسی شخص کو نہیں چھیڑنا ہے ورنہ منصوبہ چوہٹ ہو کر رہ جائے گا۔“

”اوکے۔“ وہ سوچ کر بولا ”مگر یہ بتاؤ کہ اس واردات میں کم از کم آٹھ افراد حصہ لیں گے۔ اتنے افراد ان محافظوں کی نظر میں آئے بغیر بینک کے اندر کیسے پہنچیں گے؟“
 ”بہت آسانی سے۔“ میں نے مسکرا کر کہا ”اور آغا کے سامنے بینک کا نقشہ رکھا۔“ یہ سب دیکھ رہے ہو، اس طرف بینک کا ایک دروازہ کھلتا ہے۔ جسے سینٹری والے استعمال کرتے ہیں۔ اس رات دروازے کے عین سامنے ایک بڑی وین کھڑی ہوگی اور ہم سب سے پہلے اس میں موجود ہوں گے۔“

”مگر گارڈز ایک وین کو وہاں کھڑے دیکھ کر جو کتنا نہیں ہو جائیں گے۔“ آغا نے اعتراض کیا ”ممکن ہے وہ وین کی

تمام حساس جگہوں پر نظر رکھ سکتے تھے۔ اس کے علاوہ ان کے..... کمپیوٹر میں ایسا نظام بھی نصب تھا کہ اگر وہ ہر ایک گھنٹے بعد ایک مخصوص کوڈ بیچ نہ کریں تو تھانے میں خود بہ خود الارم بجنے لگتا تھا۔ یہ کوڈ ہر روز تبدیل ہو جاتا تھا۔ یہ اس وجہ سے تھا کہ اگر ڈاکو کنٹرول روم پر قبضہ کر بھی لیں تب بھی وہ کامیاب نہ ہو سکیں کیونکہ تمام حفاظتی نظام یہیں سے قابو کئے جاتے تھے لہذا کنٹرول روم کی حفاظت پر بھی خصوصی توجہ دی گئی تھی۔ اس کا علیحدہ دروازہ جو عقبی روڈ کی طرف کھلتا تھا، بے حد مضبوط تھا۔ ایک دفعہ اندر جانے کے بعد کنٹرول روم والوں کو سوائے ہنگامی حالت کے باہر آنے کی اجازت نہیں تھی۔ وہ صرف اس وقت باہر آتے تھے، جب ان کی جگہ ڈیوٹی دینے والے دو افراد آجائیں۔ صبح آٹھ سے دوپہر دو بجے تک یہاں ایک آدمی ہوتا تھا پھر چار بجے سے رات بارہ بجے تک ایک آدمی ہوتا تھا۔ البتہ رات کے لیے ہمیشہ دو آدمی موجود ہوتے تھے۔ یہ غالباً اس لیے تھا کہ ایک آدمی کہیں غافل نہ ہو جائے، کوئی بھی گزریا محسوس کرتے ہی وہ ایک بٹن دبا کر بیک وقت بینک اور تھانے کے الارم کو آن کر سکتے تھے۔ باہر اگرچہ دو ہی گارڈز ہوتے تھے مگر یہ جدید ترین رائفلوں اور مشین گنوں سے مسلح ہوتے تھے اور بوقت ضرورت یہ پہلے گولی چلانے کے مجاز بھی تھے۔ تمام ہی گارڈز سابق فوجی کمانڈوز تھے اور ان کی اہلیت اور مہارت عام گارڈز سے کہیں بہتر تھی۔

مجھے آغا کے ذرائع پر حیرت تھی۔ وہ ایسی معلومات بھی نکال لایا تھا جسے بینک والے یقیناً بے حد خفیہ رکھتے ہوں گے۔ میرے خیال میں بینک میں اس کا کوئی آدمی موجود تھا۔ اس نے کسی کو بھاری رقم کے عوض خرید لیا تھا۔ دوسرے طریقے میں خطرہ تھا کہ ممکن ہے وہ کوئی اہم بات چھپا گیا ہو۔ میں نے آغا سے کہا۔

”کیا حفاظتی نظام کی مکمل معلومات بس یہی ہیں۔“
 اس نے پورے اعتماد سے جواب دیا ”سوائے سیف روم کے۔ بینک میں کیا جانے والا ہر حفاظتی اقدام ہمارے علم میں ہے۔ تم اس کی طرف سے بے فکر رہو۔ تم اپنی تمام تر توجہ سیف روم تک پہنچنے کی طرف رکھو۔“

”میں سیف روم دیکھ چکا ہوں اور اس کے احقر انچارج کی وجہ سے وہاں کی تمام تفصیلات سے بھی واقف ہوں۔ یہ لوگ اپنے سسٹم پر کچھ زیادہ ہی غرور کر رہے ہیں جب کہ اس میں کئی خامیاں ہیں اور ہم ان ہی سے فائدہ اٹھائیں گے۔“

اس کے اندر کا حال جان لیتا ہوں۔ وہ جس طرح تمہیں دیکھتی ہے، ان نظروں سے کوئی لڑکی صرف ایسی مرز کو دیکھتی ہے جس کے لیے اس کے دل میں کوئی جگہ ہو۔

”ممکن ہے، میں نے ہر حال ایسی کوئی بات محسوس نہیں کی اور نہ میرے پاس ان فضولیات کے لیے وقت ہے۔“

وہ کچھ دیر مجھے بے یقینی سے دیکھتا رہا پھر اس نے ملاقات ختم ہونے کا اشارہ کیا۔ اسٹڈی روم سے نکلتے ہوئے میں سوچ رہا تھا کہ کیا آغا کو ہم پر شک ہو گیا تھا۔ اب بہتر یہی تھا کہ میں اور ماہ روز احتیاط کرتے۔ کم از کم آغا پیلس کی چار دیواری میں ہم ایک دوسرے سے ملنے میں احتیاط کرتے۔ میں نے جو کچھ سوچ رکھا تھا، اس میں ماہ روز کا کردار اہم ترین تھا۔ اگر آغا اسے مجھ سے دور کر دیتا تو میں خاصی مشکل میں پڑ جاتا اور میرا تحفظ غیر یقینی ہو جاتا۔

اگلے روز میں نے خود ماہ روز کے ساتھ جانے کے بجائے اسے اکیلا بھیج دیا۔ اسے میں نے سمجھا دیا تھا کہ اسے وہاں کیا کرنا تھا۔ دراصل بچپیل مرتبہ سیف روم میں، میں نے وہاں پانچ دروازوں کے پیچھے ہینڈل دیکھے تھے۔ اندر کی جانب ان ہینڈلز کا مقصد میری سمجھ میں نہیں آیا تھا۔ صرف ایک شبہ تھا کہ کسی ہنگامی صورت حال میں یہ ہینڈل دروازوں کو اندر سے کھولنے کے کام آتے تھے۔ اگر مجھے ان ہینڈلز کے مقاصد کا علم ہو جاتا تو میرے لیے سیف روم تک رسائی آسان ہو جاتی۔ واپسی پر ماہ روز بے حد خوش نظر آئی۔

”کام ہو گیا۔“ اس نے بتایا ”وہ ہینڈلز درحقیقت اندر سے دروازوں کو کھولنے کے کام آتے ہیں۔ یعنی اگر کوئی غلطی سے اندر بند ہو جائے تو وہ ہینڈل گھما کر بے آسانی دروازہ کھول سکتا ہے۔ یہ طریقہ بے ضرر ہے نہ الارم بجتا ہے اور نہ باقی دروازے جام ہوتے ہیں بلکہ پہلا دروازہ اگر اندر سے کھولا جائے تو باقی دروازے بھی خود بخود کھل جاتے ہیں۔“

”زبردست۔“ میں نے خوش ہو کر کہا ”تم نے کارنامہ انجام دیا ہے ماہ روز۔“

”یہ تو سنو کہ کسے دیا۔ آج وہ احمق اے اے ستار مجھے اکیلا دیکھ کر ریشہ خنظمی ہوا جا رہا تھا۔ جب میں نے اسے سیف روم میں چلنے کو کہا تو اس کا بس نہیں چل رہا تھا۔ مجھے اپنے سر پر بٹھا کر لے جائے۔ میں نے اس سے کہا..... کہ.....“

”آج میں پہلی بار لا کر میں کچھ رکھنے آئی ہوں۔“

”میڈم آپ روز آئیں۔ سر آنکھوں پر آئیں۔“ وہ

قربان ہونے والے انداز میں بولا۔

”روز اگر میں کیا کروں گی؟“ میں نے معصومیت سے کہا۔

تلاشی لیں اور ہم کچھ کرنے سے پہلے ہی پکڑے جائیں یا فرار پر مجبور ہو جائیں۔“

میں معنی خیز انداز میں مسکرایا ”کیا گاؤں اس صورت میں بھی دین پر شک کریں گے جب کہ وہ دس بارہ روز سے مسلسل دین کو وہاں کھڑے ہوتے دیکھ رہے ہیں۔ وہاں ارد گرد متعدد آفس ہیں اور دین کو بے آسانی کسی کمپنی کا تصور کیا جاسکتا ہے۔ اگر دین ہر روز شام نو بجے وہاں کھڑی کر دی جائے اور صبح سات بجے ہٹالی جائے تو گاؤں پر کچھ عرصے بعد اسے معمول سمجھ کر نظر انداز کرنے لگیں گے۔“

”بہترین۔“ آغا تعریفی انداز میں بولا ”ہم اندر گھس کر کیا کریں گے؟“

”اس کے بعد کے مرحلے پر کام کر رہا ہوں۔ درحقیقت یہ سب سے مشکل مرحلہ ہے۔ ایک بار ہم لفٹ کے ذریعے سیف روم تک پہنچنے میں کامیاب ہو گئے تو پھر کوئی مسئلہ باقی نہیں ہوگا۔“

”تمہارا مطلب ہے سیف روم کے دروازے کھولنا مشکل نہیں ہے۔“ آغا نے حیرت سے کہا۔

”مشکل ہے لیکن اول تو وہاں کوئی الارم نہیں ہے پھر سیف روم مکمل طور پر ساؤنڈ پروف ہے۔ وہاں ہم کے دھماکے بھی ہوں تو نیچے والوں کو ذرا سی بھی آواز نہیں آئے گی۔“

میں نے آغا کو سیف روم کے حفاظتی انتظامات سے آگاہ کیا۔ وہ فکر مند نظر آنے لگا۔ خاص طور پر یہ سن کر کہ اگر پہلا دروازہ غلط طریقے سے کھول بھی لیا جائے تو باقی چار دروازے خود بخود جام ہو جاتے ہیں۔

”تم کہہ رہے تھے کہ وہاں کوئی مسئلہ نہیں ہے۔“ اس نے طنزیہ انداز میں کہا۔

”اس کا بھی حل میرے ذہن میں ہے مگر اس کے لیے ہمیں ایک بار پھر سیف روم کا چکر لگانا پڑے گا۔“

”کچھ بھی کرو۔“ آغا مضطرب نظر آنے لگا ”لیکن یہ منصوبہ ہر حال میں کامیاب ہونا چاہیے۔“

”میری کوشش یہی ہوگی۔“

آغا کسی سوچ میں تھا۔ اچانک اس نے معنی خیز انداز میں کہا۔ ”میں دیکھ رہا ہوں کہ لڑکی تمہارے نزدیک آتی جا رہی ہے۔“

میں نے بڑی مشکل سے خود کو چوکنے سے روکا ”ماہ

روز۔ میرا خیال ہے ہمارا تعلق صرف رسمی ہے۔“

”مجھے بے وقوف مت بناؤ۔ میں آدمی کی شکل دیکھ کر

”کیا یہ دونوں بھی اس کھیل کا ایک حصہ ہیں۔“ میں

نے خود سے پوچھا۔

جواب یقینی طور پر ہاں میں تھا۔ شبنم اور شہزاد شروع سے آغا کے ساتھ تھے۔ اس نے صرف میرے سامنے حنا کو شبنم سے چھیننے اور شہزاد سے زبردستی چیک پر سائن کرانے کا ڈراما کیا تھا ممکن ہے وہ چیک کیش نہ ہوا ہو بلکہ وہ سات لاکھ روپے آغا نے مجھے اپنی طرف سے دیے ہوں۔ یہ مجھے خوش کرنے کے لیے ایک ترکیب تھی۔ جیسے بڑے بچوں کو خوش کرنے کے لیے کبھی کبھی گھوڑا بن جاتے ہیں۔ اس کا ایک مطلب یہ تھا کہ آغا شروع سے ہی مجھے دھوکا دیتا آ رہا تھا۔ مجھے خیال آیا کہ آغا کی اسٹڈی میرے کمرے سے کچھ ہی دور تھی۔ اگر میں کھڑکی کی کارنس کے ذریعے اس کے کمرے تک جاسکتا تو اس کی، شبنم اور شہزاد کی گفتگو سن سکتا تھا۔ میں نے فوری حرکت میں آنے کا فیصلہ کیا۔ پہلے اپنے کمرے کی لائٹ بجھا کر پھر سرس کے پردے برابر کئے اور باہر آٹھ انچ چوڑی کارنس پر قدم رکھ دیا۔ خوش قسمتی سے آسمان پر بادل تھے لہذا مجھے نیچے سے دیکھا جانا ممکن نہیں تھا۔ باغ اور پورچ کی لائٹس بھی بند تھیں۔ صرف مین گیٹ کی ایک لائٹ روشن تھی مگر اس کی روشنی یہاں تک نہیں آرہی تھی۔ گرم خواب گاہ سے باہر ٹھنڈے ماحول میں آکر چند لمحوں کو میرا جسم کپکپاتا رہا پھر میں نے دھیرے سے دیوار سے چپک کر آگے کھسکا شروع کر دیا۔ مسئلہ اس وقت ہوا جب مجھے درمیان کی ایک روشن کھڑکی سے گزرتا پڑا۔ اگر عین اس وقت کوئی کھڑکی کی طرف دیکھ لیتا تو اسے میرا سایہ صاف نظر آ جاتا مگر خیریت رہی اور کسی نے شور نہیں مچایا۔ کچھ دیر بعد میں آغا کے اسٹڈی روم کی کھڑکی کے سامنے تھا۔ مصیبت یہ تھی کہ اس کھڑکی کے شیشے ٹکس تھے۔ صرف اوپر چھوٹے سے روشن دان تھے اور وہ بھی بند تھے۔ اندر سے کسی قسم کی آواز نہیں آرہی تھی مگر روشنی بتا رہی تھی کہ اندر لوگ موجود تھے۔ روشن دان ذرا بلندی پر تھے اور میں پاؤں اچکا کر ان تک پہنچ جاتا لیکن اس میں خطرہ یہ تھا کہ اگر توازن بگڑ جاتا تو میں بیس فٹ کی اونچائی سے پلے پھل کی طرح نیچے گر جاتا اور فوت بھی نہ ہوتا تو ہڈی پلے ضرور برابر ہو جاتی اور رہی سہی کسر آغا کے گرگے پوری کر دیتے لیکن اندر ہونے والی گفتگو سننے کی خواہش اتنی شدید تھی کہ میں نے ہر خطرہ مول لینے کا فیصلہ کیا۔ جسم دیوار سے چپکا کر میں آہستہ سے بچوں کے بل اوپر ہونے لگا۔ میرا دایاں ہاتھ آخری حد تک اوپر تھا اور میری کوشش تھی کہ شانے برابر رہیں ورنہ میرا

تو وہ بوکھلا گیا۔

”م... میرا مطلب ہے ہماری خدمات آپ کے لیے ہر وقت دستیاب رہیں گی۔“

”اوپر جا کر اس بد معاش نے مزید بے تکلف ہونے کی کوشش کی ہوگی۔“ میں نے حاسدانہ انداز میں کہا۔

”ایسی ویسی۔“ وہ ہنسی ”اگر میں اس سے کہہ دیتی تو وہ میرے لیے خود سیف روم لوٹنے کو تیار ہو جاتا۔ میں نے دل کھول کر اسے بے وقوف بنایا۔ میں جو پوچھتی، وہ فرمانبرداری سے اس کا جواب دیتا رہا اور جب میرا کام نکل گیا تو میں نے مصروفیت کا بہانہ بنا کر اس سے جان چھڑائی مگر چلتے چلتے اس نے مجھے ڈنر کی دعوت دے دی تھی۔“

”الو کا پٹھا۔“ میں نے جل کر کہا۔ وہ کھل کھلا کر ہنس دی۔

اسی رات مجھے نیند نہیں آرہی تھی۔ میں ماہ روز کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ جب تک مجھے حنا نہیں ملی تھی، مجھے زندگی بے مقصد لگ رہی تھی۔ اب میں اس کے لیے جینا چاہتا تھا۔ ماہ روز نے احساس دلایا تھا کہ دنیا میں صرف شبنم جیسی عورتیں ہی نہیں ہوتیں جو دولت کے لیے سب کچھ کر گزرتی ہیں، حتیٰ کہ اپنی اولاد بھی بیچ سکتی ہیں۔ ماہ روز نے جبرائیل کی دنیا میں آنکھ کھولی تھی۔ وہ ایک مجرم کے زیر سایہ مل کر جوان ہوئی تھی۔ اسے کسی نے نیکی بدی کا فرق نہیں سمجھایا تھا۔ اس کے باوجود اس کی نیک فطرت نے جب اس گندی دلدل سے نکلنے کا ایک راستہ پایا تو فوراً اس سے فائدہ اٹھانے کا فیصلہ کر لیا۔

میں سوچتے ہوئے ٹھہل رہا تھا کہ آغا پیلس کے مرکزی دروازے کے کھلنے کی آواز سن کر جو تک گیا۔ یہ گیٹ کھلنے پر ہلکی سی گھنٹی بجنے کی آواز آتی تھی۔ میں نے گھڑی کی طرف دیکھا، رات کا... ایک بج کر بیس منٹ ہوئے تھے۔ اس وقت کون آگیا۔ میں نے اپنی کھڑکی سے جھانکا۔ ایک کار آکر پورچ میں رکی۔ خلاف معمول باغ اور پورچ میں تاریکی تھی مگر جب کار کے دروازے کھلے تو ایک لمحے کو روشنی ہوئی۔ مجھے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آیا۔ کار سے شبنم اور شہزاد اترے تھے۔ وہ اندر چلے گئے۔ میں ساکت کھڑا سوچ رہا تھا کہ یہ دونوں یہاں کیسے۔ مجھے یاد تھا کہ پہلی بار آغا کے آدمی انہیں گن پوائنٹ پر یہاں لے کر آئے تھے مگر اس وقت وہ آزاد آئے تھے اور ان کے اندازے سے لگ رہا تھا کہ وہ پہلے بھی یہاں آتے رہے تھے۔ وہ کسی کی رہنمائی کے بغیر ہی آغا پیلس کے اندر چلے گئے تھے۔

تلاش کرتی رہ جائے گی۔ کسی کی توجہ ہماری طرف نہیں جائے گی اور ہم بہ آسانی اس ملک سے نکل جائیں گے۔“

سخت سردی کے باوجود باہر دیوار سے چپکے ہوئے میرا جسم سینے سے شرابور ہو گیا۔ مجھے آغا کی نیت کبھی نیک نہیں لگی تھی مگر مجھے یہ بھی نہیں معلوم تھا کہ وہ مجھے قربانی کا بکرا بنائے گا۔

”آغا از اے جینیٹس۔“ شبیم کے ہنسنے کی آواز آئی

”فائدہ آغا اور ہم اٹھائیں گے اور نقصان میں صرف جمانگیر رہے گا۔ ہی از اے گریٹ اول۔“ مجھے الو کا خطاب ملنے پر آغا اور شہزاد نے مشترکہ قہقہہ لگایا۔

”اچھا آغا صاحب، اب ہم چلتے ہیں۔ آپ ان پیپر ز پر سائن کر کے کل مجھے دفتر بھجوادیں اور پھر بے فکر ہو جائیں۔“

”جیسے جمانگیر ہو گیا تھا۔“ نہ جانے کیوں مجھے آغا کے لہجے میں طنز محسوس ہوا۔

ایک لمحے کو شہزاد خاموش ہو گیا ”توبہ کیجئے، کہاں وہ اور کہاں آپ۔ آپ کے ساتھ کوئی دھوکا کرنے کی جرات کر سکتا ہے۔“

اس کے بعد ایک ناگوار۔۔۔ سی خاموشی چھا گئی۔ کرسیاں، کھسکنے کی آواز آئی اور اس کے بعد وہ لوگ باہر نکل گئے۔ میں تیزی سے واپس اپنے کمرے میں آیا اور پردے سے پورچ کی طرف دیکھنے لگا۔ غالباً آغا خود انہیں رخصت کرنے آیا تھا کیونکہ پورچ کی تاریکی میں تین ہیولے نظر آرہے تھے۔ ان میں سے دو کار میں بیٹھ گئے جیسے ہی کار گیٹ سے نکلی، میں بستر پر آکر گر گیا۔ میرا دل سینے میں ڈھول کی طرح بج رہا تھا۔ اگلے روز ناشتے کے دوران میں نے آغا کو مطلع کیا ”منصوبہ تیار ہے۔ اس سلسلے میں مجھے کچھ افراد اور اشیاء کی ضرورت ہے۔“

”کو۔“ اس نے انداز نکلتے ہوئے کہا۔

”ایک ماہر الیکٹرونکس انجینئر، ایک ماہر قفل و تجوری شکن جو ڈائنامائٹ کا استعمال بھی جانتا ہو۔ ایک عدد اسٹک ویلڈنگ مشین جسے بہ آسانی کہیں لے جایا جاسکے۔ یہ عام نہیں ملتی۔ شاید شپ بریکنگ سے متعلق کسی ادارے کے پاس مل جائے۔ کم از کم ڈیڑھ گز لمبی ویلڈنگ اسٹیک ساتھ۔“

”مل جائے گی اور کچھ۔“

”ایک عدد چھوٹی ریموٹ کنٹرول کار، اس کا ریموٹ لازماً اتنا طاقت ور ہو کہ پانچ سو گز کے فاصلے سے بھی کار کو

توازن بگڑتے دیر نہیں لگتی۔ بہ مشکل میرا ہاتھ روشن دان کے شیشے تک پہنچ سکا اور میں یہ دعا مانگ رہا تھا کہ کہیں اندر سے بند نہ ہو۔ شاید یہ قبولیت کی گھڑی تھی۔ روشن دان کھلا ہوا تھا۔ جیسے ہی میرا ہاتھ شیشے سے ٹکرایا، اس کے پٹ بے آواز کھل گئے اور میری سماعت اندر ہونے والی گفتگو کیچ کرنے لگی۔ پہلی آواز شہزاد عباسی کی تھی۔

”آغا صاحب! تمام کام آپ کی مرضی کے مطابق ہو گیا ہے۔ پراپرٹی ڈیلر نے ایک ہفتے میں یہ سب بکوانے کا وعدہ کیا ہے۔“

”آغا آپ کو اپنا وعدہ یاد ہے نا۔۔۔۔۔!!“ شبیم کی لوج دار آواز ابھری۔ میں اس کے لہجے کو خوب پہچانتا تھا۔ اس نے جس انداز سے یہ جملہ کہا تھا اس سے مجھے لگ رہا تھا کہ آغا اور شبیم کے درمیان تعلقات اس سے کہیں زیادہ تھے، جتنے کے نظر آتے تھے۔

”یاد ہے، جیسے ہی میری دیگر پراپرٹی۔۔۔ فروخت ہوگی۔ میں ضروری کارروائی کے بعد آغا پیلس تمہارے نام کر دوں گا۔ اسے اپنی شذایات کا معاوضہ نہیں بلکہ میری طرف سے تحفہ سمجھنا۔“

”آغا صاحب! یہ آپ کا ہم پر ایک اور احسان ہوگا۔“ شہزاد عباسی کی آواز ابھری۔ کچھ توقف کر کے اس نے دوبارہ کہا ”آپ کا منصوبہ کہاں تک پہنچا؟“

”تمہیں کیا جلدی ہے۔“ آغا بولا۔

”اس شخص کی زندگی کا ایک ایک سانس مجھ پر بھاری ہے۔ جب تک وہ زندہ رہے گا، میرے سر پر تلوار لٹکتی رہے گی۔“

”اب فکر کرنے کی کیا بات ہے۔ وہ شبیم کو طلاق دے ہی چکا ہے۔“

”وہ الگ بات ہے لیکن اگر کبھی اس نے انکشاف کر دیا کہ میں نے اس کی بیوی سے شادی کی تھی۔ بغیر اسے طلاق ہوئے تو میرا تو کیریئر تباہ ہو جائے گا۔ میں بار ایسوسی ایشن کے انتخابات میں حصہ لینے کی تیاری کر رہا ہوں۔“

”تم اس کی فکر نہ کرو۔“ آغا معنی خیز انداز میں بولا ”ہم سیف ہاؤس بالکل ہی خالی نہیں چھوڑ کر آئیں گے بلکہ وہاں بینک والوں کے لیے ایک تحفہ ہوگا۔ مشر جمانگیر جو حال ہی میں بینک ڈیکیتی کے جرم میں سزا بھگت کر رہا ہوا تھا۔ سیف روم میں اس کی لاش پائی جائے گی۔ پولیس یہ نتیجہ نکالے گی کہ ڈیکیتی کے دوران میں اس کا ساتھیوں سے جھگڑا ہوا اور انہوں نے اسے گولی مار دی۔ پولیس اس کے ساتھیوں کو

اور سامان کی وجہ سے یہ گنجائش بھی کم لگ رہی تھی۔ ہم یہاں گزشتہ تین گھنٹے سے بیٹھے تھے۔ میں خدا کا شکر ادا کر رہا تھا کہ سردی کا موسم تھا۔ اگر گرمیاں ہوتیں تو ہم پسینہ بن کر بہ جاتے۔ اس کے باوجود جس سے برا حال تھا۔ خدا خدا کر کے گھڑی نے بارہ بجائے۔ دروازے کے قریب بیٹھے آٹا نے دروازہ کھولا۔ میں اور ایک دوسرا شخص جو قفل شکنی کا ماہر تھا، نیچے اترے۔ آٹا نے پہلے ہی اس گلی میں موجود پول لائٹس کا بندوبست کر دیا تھا لہذا پوری گلی تاریکی میں ڈوبی ہوئی تھی۔ میں دین کے قریب ہی رکا رہا جب کہ قفل شکن جا کر بینک کی گلی میں کھلنے والے دروازے سے نبرد آزما ہو گیا۔ عین اسی لمحے جب وہ قفل کھول چکا تھا، گلی کے سرے پر ایک گاڑ نمودار ہوا۔ خوش قسمتی سے وہ سڑک کی طرف دیکھ رہا تھا لہذا مجھے دین کے نیچے اور قفل شکن کو دروازے کے اندر ٹھنسنے کا موقع مل گیا۔ گاڑ دست روی سے دین کی طرف آنے لگا۔ تاریکی کے باعث اس نے ٹارچ لے رکھی تھی۔ جس کی روشنی وہ بینک کی دیوار اور اوپر والی کھڑکیوں پر ڈال رہا تھا۔ میں ممکنہ حد تک دین کے نیچے چلتا گیا۔ اس کے باوجود اگر گاڑ ایک بار پھر ٹارچ سیدھی کر لیتا تو میں اسے صاف نظر آ جاتا۔ وہ ست قدموں سے چلتا ہوا دین کے قریب آیا اور دروازے پر روشنی ڈالی۔ میری دھڑکنیں تیز ہونے لگیں۔ اگر وہ تالا چیک کر لیتا تو ہمارا بھانڈا پھوٹ جاتا مگر خوش قسمتی سے وہ جیسے آیا تھا، ویسے ہی چلا گیا۔ اس کے جاتے ہی میں پھرتی سے دین کے نیچے سے نکلا اور دروازے پر دستک دی۔ اندر سے کوئی جواب نہیں ملا۔ میں نے دوبارہ دروازے پر دستک دی تو اس نے خود دروازہ کھول دیا پھر میں نے دین میں ہلکی سی دستک دی۔ فوراً ہی دین کا دروازہ کھلا اور ایک دبلا چلا نوجوان باہر آیا۔ اس کے ہاتھ میں بڑے سائز کا سوٹ کیس تھا۔ یہ نوجوان الیکٹرونکس انجینئر تھا۔ اسے لے کر میں اندر گھسا اور قفل شکن نے فوراً تالا دوبارہ لگا دیا۔ اس دوران میں ہم تینوں اپنی آنکھوں پر نائٹ وژن چشمے چڑھا چکے تھے۔ یہاں گھپ اندھیرا تھا مگر ہم اپنا راستہ بہ خوبی دیکھ سکتے تھے۔ ان عینکوں کی ایک خوبی یہ تھی کہ ان کی مدد سے ہم وہ شعاعیں بھی دیکھ سکتے تھے جو خالی آنکھ سے نظر نہیں آتی تھیں۔ جیسے لیزر شعاعیں یا انفراریڈ شعاعیں..... یہ دونوں شعاعیں حفاظتی سسٹم کا لازمی حصہ تھیں۔ ان کا اصول بہت سادہ تھا۔ کسی بھی جگہ ان شعاعوں کی لائن بنادی جاتی تھی اور جیسے ہی کوئی ان کی زد میں آتا سرکٹ ٹوٹ جاتا اور الارم چلانے لگتا۔ اس معاملے میں

کنٹرول کر سکے۔ کار جتنی مختصر ہو، اتنا ہی بہتر ہے۔ کم از کم دو نائٹ وژن چشمے۔ دو عدد کیمرا کنٹرول ریکارڈنگ اور پلے بیک مشینیں، جتنی مختصر ہوں، بہتر ہے۔

”ذرا مشکل ہے لیکن میں بندوبست کر لوں گا اور کچھ۔“
 ”ایک ماہر چابی ساز جو تصویر دیکھ کر چابی تیار کر سکے۔“
 ”یہ بھی ہو جائے گا۔ اب اپنا پلان بناؤ۔“

”اس میں ہمیں سات افراد کی ضرورت ہوگی۔“ میں نے کہا اور اسے منصوبے کی تفصیل سے آگاہ کرنے لگا۔ جیسے جیسے میں بیان کرتا جا رہا تھا اس کے چہرے پر دلچسپی بڑھتی جا رہی تھی۔ آخر میں اس نے بہ مشکل اپنے جوش پر قابو پایا۔

”جہانگیر، تم نے کمال کر دیا۔ ناممکن کو ممکن کر دیا مگر مشن کے لیے کون سا دن منتخب کیا ہے؟“

”آنے والا ہفتہ کیونکہ اگلے دن اتوار کے باعث بینک بند ہوگا۔“



ہفتے کے دن میں جب بینک میں داخل ہوا تو دوپہر کے ڈیڑھ بج رہے تھے۔ بینک بند ہونے میں صرف آدھا گھنٹا باقی تھا۔ میرے ہاتھ میں ایک بڑے سائز کا بریف کیس تھا۔ اندر داخل ہو کر میں سیدھا اے اے ستار کی میز کی طرف بڑھا۔ اس نے گرم جوشی سے میرا استقبال کیا۔

”آج میں کچھ کاغذات رکھوانے آیا ہوں۔“ میں نے کہا۔

”ویلم سر! آپ ایک منٹ انتظار کریں۔ میں ابھی مسٹر رابرٹ کو کال کرتا ہوں۔“

جب تک وہ رابرٹ کو کال کر کے واپس آیا، میں میز کے نیچے رکھی ردی کی ٹوکری تلے ریموٹ کنٹرول کار رکھ چکا تھا۔ یہاں ردی کی ٹوکریاں بھی منفرد شکل کی تھیں۔ یہ اگلدان سے ملتی جلتی تھیں۔ یعنی اوپر اور نیچے سے چوڑی اور درمیان سے پتلی۔ ان کا نچلا حصہ کھوکھلا تھا اور میں نے کار وہیں رکھی تھی۔ گھر میں آزمائش کے بعد میں اس کار اور اس کے ریموٹ کی کارکردگی سے پوری طرح مطمئن تھا۔ کچھ دیر بعد رابرٹ آگیا۔ آج ان دونوں نے جب چابیاں گھمائیں تو اوپری پینل کے نیچے خانے میں چھ کاہندہ تھے۔ یعنی آج کا کوڈ چھ سات آٹھ نو صفر تھا۔ چند سیکنڈ بعد لفٹ کا دروازہ کھل رہا تھا۔



دین کے عقبی حصے میں خاصی گنجائش تھی مگر سات افراد

ساتھ جیک پن کی مدد سے منسلک کیا۔
 ”گنتی دیر کی ریکارڈنگ کروں سر؟“ اس نے مجھ سے دریافت کیا۔
 ”ایک منٹ کی۔“

اس نے مشین کا ریکارڈنگ کا بٹن دبایا اور گھڑی کی طرف دیکھنے لگا پھر اس نے دوسری مشین سے ریکارڈنگ کی۔ اس کے بعد بریف کیس سے دو تار نکالے۔ انہیں مشینوں سے منسلک کیا اور ان کے دوسرے سرے نہایت احتیاط کے ساتھ جنتن باکس میں کنٹرول روم تک جانے والی لائنوں سے جوڑ دیے اور پھر کمرے سے آنے والی تاروں کو جنتن سے الگ کر کے اپنے ٹی وی سیٹس کے ساتھ منسلک کر لیا۔ اب ہال کا منظر جو جاری تھا، وہ ہم دیکھ رہے تھے اور کنٹرول روم والے صرف ایک ریکارڈ شدہ منظر دیکھ رہے تھے کیونکہ منظر میں کوئی چیز متحرک نہیں تھی لہذا انہیں قطعی علم نہیں تھا کہ وہ صرف ایک منٹ کا منظر بار بار دیکھ رہے ہیں جیسے ہی نوجوان انجینئر نے کام سے فارغ ہوا، میں نے کارڈ ریموٹ نکالا اور اس کے بٹن پر ہاتھ رکھ دیا۔ میری نظر اس اسکرین پر مرکوز تھی جس میں اے اے ستار کی میز نظر آرہی تھی۔ مجھے قطعی علم نہیں تھا کہ میری رکھی ہوئی کارڈ نوکری کے نیچے موجود تھی یا کوئی اسے نکال لے گیا تھا۔ اس لمحے میں نے سکون کا سانس لیا۔ جب میز کے نیچے سے نوکری نکلتی نظر آئی۔ جیسے ہی وہ ایک فٹ آگے ہوئی قیامت خیز الارم بجنا شروع ہو گیا۔ آواز اتنی زیادہ تھی کہ اس بند کمرے میں بھی کانوں کے پردے پھٹے جا رہے تھے۔ میں نے تیزی سے کارڈ واپس کیا اور نوکری اپنی جگہ چلی گئی۔ نوجوان انجینئر نے بڑی پھرتی سے پلے بیک مشینوں کے تار الگ کئے اور اس سے پہلے وہ کمرے سے آنے والے تار دوبارہ جنتن باکس میں لگانا نہیں بھولا تھا۔ اب کنٹرول روم والے اپنی اسکرینوں پر ہال کا حقیقی منظر دیکھ رہے تھے۔

ایک منٹ بعد گارڈز داخلی دروازہ کھول کر ہال میں گھسے۔ ان کے ہاتھوں میں سب مشین گنیں تھیں اور وہ پوری طرح چوکس تھے۔ ہال کو خالی پا کر انہیں حیرانی سی ہوئی۔ اس کے بعد وہ میزوں کے پیچھے جھانکنے لگے۔ اگلے ایک منٹ میں انہیں معلوم ہو گیا کہ ہال میں کوئی نہیں تھا۔ اس کی اطلاع انہوں نے واک ٹاک پر کنٹرول روم کو دے دی۔ ٹھیک پندرہ منٹ بعد پولیس دندناتی ہوئی اندر گھس آئی۔ اس دستے کی قیادت ڈی ایس پی کر رہا تھا۔ اس اثنا میں غالباً کنٹرول روم والے الارم کو بند کر چکے تھے۔ ڈی ایس پی نے دونوں

بہت احتیاط کی ضرورت تھی۔ کچھ دیر بعد ہم سوئچ روم کے سامنے تھے کیونکہ بینک میں نصب تمام تر حفاظتی بجلی، انٹرکام اور کیمرے کی تاریں یہیں سے گزرتی تھیں لہذا اس کا دروازہ بھی غیر معمولی طور پر مضبوط بنایا گیا تھا۔ قفل شکن نے اپنے اوزار سنبھالے اور ٹارچ کی روشنی میں لاک کھولنے میں لگ گیا اور جب اس نے صرف ایک منٹ بعد ہی بظاہر خاصا پیچیدہ نظر آنے والا تالا کھول لیا تو میں دل ہی دل میں اس کی صلاحیتوں کو سراہے بغیر نہ رہ سکا۔ سوئچ روم میں گھس کر ہم نے پہلے روشنی جلائی کیونکہ یہاں سے باہر دیکھ لیے جانے کا کوئی امکان نہیں تھا۔ تالے کے اندرونی حصے میں لٹو لگا تھا جسے گھما کر تالا کھولایا بند کیا جاسکتا تھا۔ ہم نے دروازہ لاک کر دیا۔ یہاں سے نوجوان انجینئر کا کام شروع ہوتا تھا لہذا میں اور قفل شکن ایک کونے میں کھڑے ہو گئے۔ یہاں ہر طرف تار، سوئچ اور سرکٹ بریکر لگے ہوئے تھے۔

نوجوان انجینئر نے اپنا سوٹ کیس کھولا اور اس میں سے کچھ اوزار نکال کر وہاں موجود جنتن باکسز کو چیک کرنے لگا۔ بالآخر اس نے کیمرا تاروں کا جنتن ڈھونڈ نکالا۔ اس نے سوٹ کیس سے ایک چھوٹا سا ٹی وی نکالا جس پر چار بالی چار انچ کی اسکرین تھی۔ اس میں دو تار نکلے ہوئے تھے جن کے سروں پر مگر جھ کے دانٹوں نما کلپ لگے تھے۔ نوجوان نے۔۔۔ ٹی وی کو کسی سلوشن کی مدد سے دیوار پر چپکایا اور پھر تار جنتن کے دو پوائنٹس پر لگا دیا اور بن دبا کر ٹی وی آن کر دیا۔ یہ بیٹری سیل سے چلنے والا ٹی وی تھا۔ فوراً ہی اس کی اسکرین روشن ہو گئی اور اس پر وہاں کے داخلی دروازے کا منظر نظر آنے لگا۔ نوجوان انجینئر نے سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھا۔ میں نے نفی میں سر ہلایا۔ اس نے کلپ کو نکال کر دوسرے پوائنٹس پر لگائے۔ اس دفعہ اس حصے کا منظر آیا۔ جہاں پر اے اے ستار کی میز تھی۔ میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ نوجوان انجینئر کے بریف کیس سے ویسا ایک اور ٹی وی برآمد کیا اور اسے بھی دیوار کے ساتھ چپکا کر اس کے کلپ تیسرے پوائنٹس پر لگائے۔ اس دفعہ سیف لاکر تک جانے والی لفٹ نظر آنے لگی۔ میں نے ایک بار پھر اثبات میں سر ہلایا۔ نوجوان نے مطمئن ہو کر اس دفعہ بریف کیس سے ایک جیسی دو پور نیبل ریکارڈنگ اور پلے بیک مشینیں نکالیں۔ اس قسم کی مشینیں کسی بھی منظر کو ریکارڈ کر کے اسے فوری نشر کرنے کی صلاحیت رکھتی ہیں۔ نوجوان انجینئر نے باری باری دونوں مشینوں کو مختصر ٹی وی سیٹس کے۔۔۔

نہ پا کر ڈی ایس پی کا غصے سے برا حال ہو گیا۔ اگرچہ اس کی آواز تو نہیں آرہی تھی لیکن چہرے کے تاثرات سے صاف لگ رہا تھا کہ وہ اسی وقت بینک اور اس کے الارم کی شان میں قصیدہ گوئی میں مصروف ہے۔ کچھ نہ ملنے پر وہ بکنا جھکتا واپس چلا گیا۔ پولیس کی واپسی کے بعد غالباً کنٹرول روم والوں کی ہدایت کے مطابق گارڈز نے باہر جانے کے بجائے ہال ہی میں ڈیرا جمایا۔ میں پریشان ہو گیا۔ اگر یہ اسی طرح یہاں بیٹھے رہے تو میرا کام مشکل ہو جائے گا پھر مجھے ایک نادر خیال سوچا۔ گارڈز نظر نہ آنے والی شعاعوں کے جال میں مداخلت کے خیال سے مرکزی دروازے کے سامنے بیٹھے تھے۔ وہاں سے وہ اے اے ستار کی میز کی طرف نہیں دیکھ سکتے تھے۔ میں نے نوجوان انجینئر کو اشارہ کیا۔ اس نے ایک بار پھر کارروائی کی۔ میں نے ہر ممکن تیزی سے باسکٹ مطلوبہ حد تک کھسکا کر واپس کر لی۔ اس دفعہ الارم گارڈز کی موجودگی میں بجاتا تھا لہذا وہ حیرت زدہ رہ گئے۔ کچھ دیر بعد پولیس اور اس کے ساتھ ہی بینک کے اعلیٰ حکام بھی آگئے۔ ان کے درمیان تقریباً گھنٹے بھر تک مذاکرات ہوتے رہے۔ ڈی ایس پی سخت طیش میں تھا۔ یہ اس کی پوری سروس کا واحد موقع ہوگا، جب اسے ایک ہی جگہ تین دفعہ جانا پڑا ہوگا اور آخر میں کھودا پہاڑ نکلا چوہا والا معاملہ پیش آیا ہوگا۔ میں نے گھڑی کی طرف دیکھا۔ ایک بج کر پچپن منٹ ہو رہے تھے۔ وقت تیزی سے گزر رہا تھا۔ خدا خدا کر کے پولیس اور بینک افسران دفع ہوئے۔

نوجوان انجینئر نے بیزاری کے عالم میں چوتھی مرتبہ جنکشن باکس میں تاریں الگ کیں اور پلے بیک مشینوں کی تاریں لگائیں۔ میں نے دھڑکتے دل کے ساتھ ردی کی ٹوکری کو حرکت دی۔ ٹوکری ایک فٹ آگے نکلی پھر دو فٹ آگے نکل گئی۔ مجھے شادی مرگ ہوتے ہوتے رہ گیا۔ میں اپنے مقصد میں کامیاب رہا تھا۔ لفٹ تک ہماری محفوظ رسانی کے لیے ضروری تھا کہ ہال میں نظر نہ آنے والی شعاعوں یا دوسرے لفظوں میں الارم سسٹم بند کر دیا جائے۔ پولیس کو بار بار بلانے کا مقصد بھی یہی تھا کہ اس نظام کو بند کر دیا جائے اور ایسا ہی ہوا۔ میں نے ٹوکری واپس اپنی جگہ کی اور قفل شکن کو تالا کھولنے کو کہا۔ اس نے تالا کھولا۔ ہم باہر آگئے۔ کچھ دیر بعد آغا اور اس کے دیگر ساتھی مع ساز و سامان کے اندر آچکے تھے۔ ہال میں داخل ہونے سے پہلے میں نے ایک بار نائٹ وژن عینک سے دیکھ کر تسلی کر لی۔ واقعی الارم سسٹم بند کر دیا گیا تھا۔ اب میرا اور قفل شکن کا کام شروع ہونا تھا۔

گارڈز سے کچھ گفتگو کی اور اندر کی جانب بڑھا۔ ہال سے اندر کی جانب آنے والے تمام دروازے بھی مقفل تھے۔ گارڈز کے پاس ان کی چابیاں تھیں۔ انہوں نے تالے کھولے۔ فوراً ہی پولیس پچھلے حصے میں گھس آئی۔ اب وہ ہاتھ روم اور اسٹور وغیرہ دیکھ رہے تھے۔ اسی اثنا میں ہم سوئچ روم کی لاسٹ بجھا چکے تھے۔

”اوائے یہ دروازہ کیوں بند ہے۔“ اچانک کسی پولیس والے نے سوئچ روم کے دروازے پر ہاتھ مار کر کہا۔

”یہ سوئچ روم ہے اس کا دروازہ مستقل بند رہتا ہے۔ اس کی چابی کنٹرول روم والوں کے پاس ہے۔“

”کھلو آؤ اسے۔“ وہی آواز آئی اور میرے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے۔ مجھے جو معلوم ہوا تھا اس کے مطابق سوئچ روم کی چابی منیجر کے پاس تھی جب کہ گارڈ کنٹرول روم والوں کے پاس بتا رہا تھا۔ ہم تینوں نے بے اختیار اپنے پستول نکال لیے۔ میں نے عمارت کے مرکزی مین سوئچ پر ہاتھ رکھ دیا۔ میں نے فیصلہ کیا جیسے ہی دروازہ کھلے گا میں مین سوئچ آف کر دوں گا اور پھر ہم تاریکی کا فائدہ اٹھا کر فرار ہونے کی کوشش کریں گے۔ اگرچہ اس میں کامیابی کی امید نہ ہونے کے برابر تھی۔ گارڈ کہہ رہا تھا۔

”کنٹرول روم والوں کے پاس چابی ضرور ہے مگر وہ اس کمرے کو سوائے ہنگامی حالت کے کھولنے کے مجاز نہیں ہیں۔ ویسے بھی آپ دیکھ رہے ہیں کہ یہ لاک ہے۔ یہاں کسی کی موجودگی کے امکانات نہیں ہیں۔“

”ٹھیک ہے،“ اوکے ڈی ایس پی صاحب کو رپورٹ کرو یہاں بھی کوئی بندہ نہیں ہے۔“

چند لمحوں بعد پولیس والے پھر ہال میں جمع تھے۔ جہاں ڈی ایس پی انٹرکام پر غالباً کنٹرول روم والوں سے کچھ بات کر رہا تھا اور ظاہر ہے یہی پوچھ رہا ہوگا کہ جب کوئی بندہ بشر یہاں ہے نہیں تو یہ خبیث سائرن کیوں چلایا تھا۔ کنٹرول روم سے کیا جواب ملا۔ یہ نہیں معلوم لیکن کچھ دیر بعد پولیس پارٹی وہاں سے جا رہی تھی۔ ان کے جانے کے بعد گارڈز بھی باہر چلے گئے۔ میں نے ایک گہری سانس لے کر پستول واپس جیب میں رکھ لیا۔ ہم بال بال بچے تھے۔ اگر وہ پولیس والا اپنی بات پر اڑ جاتا تو ہم یقیناً پکڑے جاتے۔ گارڈز کے جانے کے دس منٹ بعد میں نے ایک بار پھر باسکٹ کو حرکت دی۔ اگلے ہی لمحے الارم پھر چلا رہا تھا۔ نوجوان انجینئر نے پھرتی سے سابقہ عمل کو دہرایا۔ اس کے بعد سب کچھ پھر وہی ہوا۔ گارڈ آئے ان کے پیچھے پولیس آئی اور اس دفعہ بھی ہال میں کسی کو

مہانجوس

ایک شخص (اپنے کنجوس دوست سے) سو روپے
ادھار دے سکتے ہو؟
دوست ”نہیں۔“
شخص ”پچاس روپے؟“
دوست ”نہیں۔“
شخص ”اچھا ایک روپیہ؟“
دوست ”وہ بھی نہیں۔“
شخص ”ایک سگریٹ ہی پلا دو۔“
دوست ”میں سگریٹ نہیں پیتا۔“
شخص ”اچھا تو اپنی گھڑی میں دیکھ کر وقت ہی
بتا دو۔“

دوست ”معاف کیجئے، گھڑی کے چمکیلے ڈائل کی
طرف بار بار دیکھنے سے میری نظر کمزور ہو جائے گی اور
خواہ مخواہ ڈاکٹر کی فیس ادا کرنی پڑے گی۔“

چڑھائے، اپنے بیگ سے ایک مخصوص طرز کی چھڑی کے
حصے برآمد کر کے انہیں جوڑا اور چھڑی کو سوراخ سے گزار کر
دوسری طرف پہنچا دیا۔ جیسے ہی اس کا لیور کھینچا، چھڑی کے
دوسری طرف آنکڑا سا بن گیا۔ میں نے ذہن میں دروازے
کے اندرونی ہینڈل کا جائے وقوع تازہ کیا اور آنکڑے کی مدد
سے اسے پکڑنے کی کوشش کرنے لگا مگر ہدف ہینڈل آنکڑے
کی گرفت سے پھسل جاتا۔ کئی کوششیں ناکام رہیں۔ میرا جسم
پسنے میں شرابور ہوتا جا رہا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ سوراخ ذرا
سائیز بڑھا ہو گیا تھا۔ اس وجہ سے ہینڈل گرفت میں نہیں آ رہا
تھا۔ اچانک ہلکی سی کھٹ کی آواز آئی۔ چند لمحے تک تو مجھے
یقین ہی نہیں آیا کہ میں ہینڈل گرفت کرنے میں کامیاب رہا
تھا مگر جب چھڑی گھمانے کے ساتھ ہی دروازے کا ہینڈل بھی
گھومنے لگا تو میرا شبہ یقین میں تبدیل ہو گیا۔
”کیا ہوا؟“ آغا سے ضبط نہ ہو سکا۔

”کامیابی۔“ میں نے چھڑی پوری طرح گھمائی اور اس
کے ساتھ ہی ٹکک کی ہلکی سی آواز کے ساتھ فولاد کا دزنی ترین
دروازہ بے آواز طریقے سے خود بہ خود کھلنے لگا۔ پہلے تو وہ سب
چند لمحے اس منظر کو بے یقینی سے دیکھتے رہے پھر ان کے حلق
سے قہقہے ابل پڑے۔ وہ چیخ چلا رہے تھے اور بالکل دیوانے

ہمارے پاس ہک نما چابیوں کے متعدد نمونے موجود تھے جو
ہمیں باری باری آزمانے تھے۔ خوش قسمتی سے پہلی دفعہ میں
ہی میرے حصے کی چابی لگ گئی۔ البتہ دوسری چابی نے گھومنے
سے انکار کر دیا۔ میں نے میسٹر نکال کر چیک کیا۔ لفٹ کے
دروازے میں کرنٹ آ رہا تھا۔ جیسے ہی چابیاں نکالی گئیں کرنٹ
بند ہو گیا۔ ساتویں کوشش میں دوسری چابی بھی ٹھیک لگ گئی
اور ہم آٹھویں کوشش میں لفٹ بلانے میں کامیاب ہو گئے۔
چند لمحے بعد بے آواز لفٹ ہمارے سامنے آ کر رکی۔ ہم سب
مع سامان کے اس پر سوار ہو گئے اور چند سیکنڈ بعد ہم سیف
روم کے پہلے دروازے کے سامنے تھے۔ وہاں تاریکی تھی مگر
اب دیکھ لے اور سن لے جانے کا کوئی خطرہ نہیں تھا۔ لہذا ہم
روشنی کر کے بات چیت میں مصروف ہو گئے۔ آغا کے دو
ساتھی بھاری بھرکم ویلڈنگ مشین کو جوڑنے لگے۔

خاصے غور و خوض کے بعد میں نے دروازے کے اس
حصے پر نشان لگایا۔ جہاں ویلڈنگ مشین آزمائی جاتی تھی۔
”خیال ہے کہ سوراخ بالکل سیدھا ہوتا ہے۔“ میں نے
انہیں خبردار کیا۔

”فکر ہی نہ کرو جی۔“ ایک بولا ”بالکل سیدھا سوراخ
ہوگا۔“

انہوں نے مشین کے آگے تقریباً ڈیڑھ گز لمبی ویلڈنگ
اسٹک لگائی اور اپنی آنکھوں پر سیاہ چستے چڑھالیے۔ ہم سب
دروازے سے ذرا دور ہٹ گئے اور دروازے کی طرف پیٹھ
کر لی۔ جیسے ہی انہوں نے اسٹک دروازے سے لگائی۔ ایک
خیرہ کن چمک کمرے میں پھیل گئی۔ چرچراہٹ کی آواز بہت
تیز تھی۔ کمرادھوئیں سے بھرنے لگا لیکن ہمیں یہ سب کچھ
برداشت کرنا ہی تھا۔ مسلسل استعمال کے بعد اسٹک صرف
پانچ منٹ میں ختم ہو گئی۔ میں نے پلٹ کر سوراخ کا معائنہ کیا
جو ابھی صرف ایک فٹ ہی ہوا تھا لیکن بالکل سیدھا تھا۔ اسی
اثنا میں مشین پر دوسری اسٹک لگائی جا چکی تھی۔ وہ پھر پوری
جائفشانی سے سوراخ کرنے میں لگ گئے۔ اب کمرے میں اتنا
دھواں بھر گیا تھا کہ ہمارے پیپڑے جلنے لگے تھے۔ دوسری
اسٹک ختم ہوتے ہوتے سوراخ دو تہائی ہو چکا تھا۔ تیسری
اسٹک ابھی ختم نہیں ہوئی تھی کہ اس کی کارآمد لمبائی ختم
ہو گئی۔ مجبوراً اگلی اسٹک لگانی پڑی۔ اب مزید صرف دو
اسٹکیں رہ گئیں تھیں۔ اگر یہ بھی ختم ہو جاتیں تو سوراخ
نامکمل رہ جاتا مگر جو بھی اسٹک نے کام کر دکھایا۔

میں نے زور ڈال کر دیکھا۔ سوراخ واقعی آ رہا تھا اور
بظاہر سیدھا ہی لگ رہا تھا۔ میں نے رر کے موٹے دستانے

مرکوز تھی۔ اسی اثنا میں مجھے رائل کی سیفیٹی کیج کے ہٹائے جانے کی آواز آئی مگر میں نے اوپر سے نگاہیں نہیں ہٹائیں البتہ میرے جسم نے ٹھنڈا پسینہ اگلنا شروع کر دیا تھا۔ ماہ روز پہلے ہی کھیلنے کے انداز میں باہر نکل گئی۔ دس منٹ ہو چکے تھے اور میں منتظر تھا کہ پہلے آغا کی رائل سے گولی برآمد ہوئی ہے یا اوپر سے لوہے کی سلاخیں۔ کوئی مجھے کہہ رہا تھا۔ میں بھاگ نکلوں۔ موت آغا کی شکل میں میرے پیچھے کھڑی ہے۔ میرے اعصاب تار کی طرح تن گئے تھے اور ٹوٹنے کے قریب تھے۔ معاً مجھے ہلکی سی سرسراہٹ سنائی دی اور میں نے دروازے سے باہر چھلانگ لگا دی۔ زمین پر گرتے ہی میں بے تحاشا اٹھ کر دوڑا اور یکے بعد دیگرے بائی دروازے پھلانگتا چلا گیا۔ پیچھے سے کوئی گولی نہیں چلی۔ غالباً آغا اور اس کے ساتھی اوپر سے لوہے کی سلاخیں گرتے دیکھ کر دم بہ خود رہ گئے تھے مگر جب میں آخری دروازے سے نکل رہا تھا۔ پیچھے سے ایک برسٹ چلا اور گولیاں میرے اوپر سے گزر گئیں اور میں خود لفٹ کے دروازے کے سامنے جا گرا۔ یہی جگہ فی الوقت محفوظ تھی۔ مجھے یوں گرتے دیکھ کر مارہ روز کے منہ سے چیخ نکل گئی ”جہانگیر“

”میں ٹھیک ہوں۔“ میں نے اٹھتے ہوئے کہا ”فوراً“

یہاں سے نکل چلو۔“

آغا چیخ چیخ کر مجھے نادر الوجود اور ناقابل اشاعت گالیاں دے رہا تھا۔ میں نے فلمی ولن کی طرح تہقہ مارا۔

”آغا سُر کے نیچے۔ تو یہاں آنے کے لیے بہت بے چین تھا۔ دیکھ میں نے تجھے یہاں پہنچا دیا۔ اب یہاں سے نکلتا تیرا مسئلہ ہے۔“

”تو کیا سمجھتا ہے۔ یہ سلاخیں میرا راستہ روک لیں گی۔“ آغا نے دھاڑ کر کہا۔

”کم از کم اس وقت تک تو روک کر رکھیں گی جب تک ہم یہاں سے نکل نہیں جاتے۔“

ایک لخت آغا نے ٹینچلی بدلی اور منت سماجت کرنے لگا۔ ساتھ ہی اس نے مجھے ڈاکے میں نصف حصہ دینے کی پیش کش کی مگر اب میں مزید وقت ضائع کرنے کے موذ میں نہیں تھا۔ میں نے جب لفٹ کا دروازہ کھولا تو آغا اور اس کے جھلائے ہوئے ساتھی بے تحاشا گولیاں برسا رہے تھے۔ ہم محفوظ تھے۔ البتہ سامنے کی دیوار چھلنی ہوئی جا رہی تھی۔

”جہانگیر نکل چلو۔“ ماہ روز نے کانپتی آواز میں کہا۔

”کہیں یہ سچ سچ نہ نکل آئیں۔“

”فکر مت کرو۔ ایک انچ موٹی سلاخوں کو توڑنا ان کے

لگ رہے تھے۔ فوراً آغا بھی اپنا وقار بھول گیا مگر تمام تر جوش کے باوجود انہوں نے سیف روم کے اندر جانے کی کوشش نہیں کی۔ پہلے میں نے نائٹ وژن سے اندر کا جائزہ لیا۔ مجھے کہیں بھی کوئی شعاع نظر نہیں آئی۔ اندر کی روشنیاں دروازہ کھلتے ہی خود بہ خود جل اٹھیں۔ پہلے میں اندر گیا۔ میرے پیچھے آغا اور اس کے ساتھی۔ انہوں نے اپنا تمام سامان وہیں چھوڑ دیا۔ البتہ ان کا اسلحہ ان کے پاس ہی تھا۔ میں دیکھ رہا تھا کہ آغا نے اپنی رائل ہاتھ میں لے لی تھی۔

”ہمیں جلد از جلد اپنا کام ختم کر لینا ہے۔“ میں نے گھڑی دیکھ کر کہا ”ہمارے پاس اب صرف دو گھنٹے ہیں۔“

پہلے سے طے شدہ پروگرام کے مطابق ہمیں ہر صورت میں صبح ساڑھے پانچ بجے یہاں سے نکل جانا تھا۔ اس کے بعد سڑکوں پر آمدورفت شروع ہو جاتی تھی۔ رات کے ساڑھے تین بج رہے تھے۔ آغا کے اشارے پر قفل شکن تجوری کی طرف بڑھا اور اپنے اوزار نکال کر اسے کھولنے کی کوشش شروع کر دی۔ صرف اسی تجوری میں کروڑوں کی کرنسی اور قیمتی اشیاء تھیں جن میں ایک نجی کمپنی کا تقریباً ایک سو بیس کلو گرام سونا بھی شامل تھا۔ صرف اس سونے کی مالیت پچاس لاکھ روپے تھی۔ میری نگاہ گھڑی پر مرکوز تھی۔ جیسے ہی میں نے سیف روم میں قدم رکھا تھا، اس کی اسٹاپ واچ چلا دی تھی۔ جس کے مطابق ساڑھے پانچ منٹ گزر چکے تھے اور میں دیکھ رہا تھا کہ ہر گزرتے لمحے میں آغا کے تیور خراب ہوتے جا رہے تھے۔ مجھے اس کے پروگرام کا علم تھا اور میں دل ہی دل میں دعا کر رہا تھا کہ وہ اپنے ارادے پر فوری عمل نہ کر گزرے۔ گھڑی کی سوئی نہایت سست رفتاری سے چل رہی تھی۔ بالآخر میں نے بتدریج پیچھے سرکنا شروع کر دیا۔ ماہ روز میری طرف ہی دیکھ رہی تھی۔ وہ خود بھی غیر محسوس انداز میں دروازے کی طرف آنے لگی۔ اسٹاپ واچ آٹھ منٹ گزار چکی تھی اور میں چاہتا تھا کہ اس وقت کوئی بھی میری اور ماہ روز کی طرف متوجہ نہ ہو۔ خوش قسمتی سے اس لمحے تجوری کی طرف سے کلک کی آواز آئی۔

”کھل گئی۔“ آغا کے منہ سے چیخ نکل گئی اور وہ بے تابی سے تجوری کی طرف بڑھا۔

نومنت گزر چکے تھے۔ اب میں اور ماہ روز بالکل دروازے کے نزدیک تھے۔ آغا تمام تر بے تابی کے باوجود احتیاط کر رہا تھا۔ پہلے اس نے قفل شکن کو تجوری میں کرنٹ یا الارم وغیرہ چیک کرنے کا حکم دیا۔ نومنت اور تمیں سیکنڈ ہو گئے تھے۔ میں نے اپنا پیر دروازے پر رکھا۔ میری نگاہ اوپر

چیک بھی تھے۔

”تھینک یو نوجوان۔“ میں نے جیب سے پاکستانی نوٹوں کی گڈی نکال کر اسے تھمائی۔ ”تم یقیناً اپنے باپ کا نام روشن کرو گے! اور ہاں ایک درخواست ہے یہ کار حادثہ ریٹ اے کار والوں کی ہے۔ شاہراہ فیصل پر ان کا آفس ہے۔ کار انہیں واپس کرتے جانا۔“

”کیوں نہیں۔“ وہ خوش دلی سے بولا اور کار لے کر روانہ ہو گیا۔

میں اور ماہ روز تقریباً بھاگتے ہوئے ڈیپارچر میں داخل ہوئے۔ معلوم ہوا کہ مسافر طیارے میں جا چکے ہیں۔ ہم نے طیارے کے ایگزٹ کی طرف دوڑ لگائی۔ اس وقت دروازہ بند ہونے والا تھا مگر ہمیں دیکھ کر دروازہ کھول دیا گیا۔ طیارے میں داخل ہوتے ہی ایسا لگا جیسے ہم ہر خطرے کو کہیں دور چھوڑ آئے تھے۔ میں نے اور ماہ روز نے مسکرا کر ایک دوسرے کو دیکھا اور پھر اپنی سیٹیں تلاش کرنے لگے جو جہاز کے درمیان میں تھیں۔

”شکر ہے خدا کا۔“ ماہ روز نے نشست پر بیٹھ کر کہا ”حنا کو اس نے کنارے والی سیٹ پر لٹا دیا۔ وہ سوچکی تھی۔“

میں نے اس کا ماتھ تھام لیا۔ ”روز“ میں تمہیں کچھ

بس کی بات نہیں ہے۔“ میں نے مسکرا کر لفٹ کا بٹن دبایا۔ نیچے لفٹ سے نکل کر میں نے ایک کرسی اس کے دروازے میں پھسادی۔ اگر آغا اور اس کے ساتھی سلاخیں توڑ کر باہر بھی نکل آئیں تو لفٹ کی غیر موجودگی میں ان کے نیچے آنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ عقبی دروازہ مشغل تھا لیکن اتنی تھکن بخشی تو مجھے بھی آتی تھی کہ میں اسے کھول سکتا۔ عقبی گلی میں وین سے ذرا پیچھے ایک سوزو کی کھڑی تھی۔ میں نے اس کے دروازے کو کھولا اور اشارت کر کے ہر ممکن تیزی سے وہاں سے روانہ ہو گئے۔ اس وقت تین بج کر پچیس منٹ ہوئے تھے۔

”ہم لیٹ نہ ہو جائیں۔“ ماہ روز تشویش سے بولی۔

”فکر مت کرو۔ ہم ٹھیک وقت پر پہنچ جائیں گے۔“

آدھے گھنٹے بعد ہم آغا پیلس کے سامنے تھے۔ گیٹ کے گارڈ نے آکر حیرت سے ہمیں دیکھا ”آغا صیب کہاں ہے؟“ ”ہمارے پیچھے۔“ میں نے مسکرا کر کہا اور اپنے پیچھے دیکھنے لگا۔ والے گارڈ کے سر پرستول رسید کیا۔ وہ فی الفور بے ہوش ہو گیا۔ اسے اس کے کیمین میں ڈال کر اور اس کے ہاتھ پیر باندھ کر میں اور ماہ روز آغا پیلس میں گھسے۔ مجھے معلوم تھا کہ اندر سوائے بن مانس کے کوئی نہیں تھا اور وہ حسب معمول اپنے کمرے میں وی سی آر پر کچھ ناگفتن قسم کی فلم دیکھ رہا تھا۔ مجھے حیرت تھی کہ وہ سوتا کس وقت تھا۔ حنا اپنے کمرے میں تھی اور جاگ رہی تھی۔ مجھے دیکھ کر وہ اچھل کر مجھ سے لپٹ گئی۔

”پاپا۔“ اس نے کہنا چاہا مگر میں نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔

”پاپا کی جان بولنا مت۔ ہم یہاں سے بھاگ رہے ہیں۔“

ماہ روز نے جلدی جلدی اس کی چیزیں سمیٹیں اور ہم باہر نکل گئے۔ اس وقت چار بج کر دس منٹ ہوئے تھے۔ میں نے گاڑی بحر ظلمات کے گھوڑے کی طرح دوڑائی اور پونے پانچ بجے ہم ایئر پورٹ پر تھے۔ انٹرنیشنل لاؤنج کے قریب ٹھہرتا ہوا نوجوان ہمیں دیکھتے ہی بے قراری سے ہماری طرف لپکا۔

”جہانگیر صاحب آپ تاخیر سے آئے ہیں۔ وقت کم رہ گیا ہے۔“ اس نے ایک لفافہ نکال کر مجھے دیا ”اس میں سب کچھ ہے۔“

میں نے اسے کھول کر دیکھا۔ اس میں دو پاسپورٹ تھے۔ مسز اور مسٹر امیر الدین کے نام سے حنا کی انٹرنی ماہ روز کے پاسپورٹ میں تھی۔ لفافے میں ماہ ہزار ڈالر کے ٹریولز

سیڑھیاں چڑھ کر طیارے میں اندر آ رہے تھے۔ دروازے پر ایک اتر ہو سٹس اور اس کے ساتھی اسٹیورڈ موجود تھے۔ جیسے ہی انپکٹر نے طیارے میں قدم رکھا۔ سیٹ بیلٹ کھول کر میکا کی انداز میں اٹھ کھڑا ہوا۔ انپکٹر نے اندر گھستے ہی مسافروں کا جائزہ لیا اور اتر ہو سٹس سے کہا۔

”مس، منسٹر صاحب کہاں ہیں۔“

”ظاہر ہے فرسٹ کلاس میں۔“ اتر ہو سٹس نے
بیمزاری سے کہا ”لایئے ان کا سگریٹ کیس۔“

انپکٹر نے اتر ہو سٹس کو ایک عام سا سگریٹ کیس تھمایا اور دروازے سے باہر نکل گیا۔ اگلے ہی لمحے دروازہ بند ہو گیا۔ میں ہوا نکلے غبارے کی طرف سیٹ پر ڈھیر ہو گیا۔ ماہ روز جو چند لمحے پہلے سسکیاں لے رہی تھی، بے تحاشا ہنس رہی تھی اور اپنی ہنسی کو بلند ہونے سے روک رہی تھی۔ دوسرے مسافر بھی تھمتے لگا رہے تھے۔ ظاہر ہے بات ہی ستم ظریفانہ تھی۔ کسی وزیر صاحب نے اپنے سگریٹ کیس کے لیے دوڑتے طیارے کو روک لیا تھا۔

”ہائے بے چارے ہیرو صاحب۔“ ماہ روز مجھے دیکھ کر بولی ”قربانی دینے جا رہے تھے۔“

میں خفت سے مسکرایا ”مجھے کیا معلوم تھا کہ وہ کسی وزیر کا سگریٹ کیس دینے آئے تھے۔“

”مزہ تو اس وقت آتا جب جناب رضا کارانہ گرفتاری پیش کرتے اور وہ انپکٹر بھی دنگ رہ جاتا جو آیا تو سگریٹ کیس دینے تھا اور اس کے ہاتھ ایک ڈاکو لگ جائے۔“

”میں نے سوائے تمہارے دل کے اور کچھ نہیں چرایا۔“ میری جوابی سرگوشی نے اس کی زبان بند کر دی۔

طیارہ اب خیر فزاری سے دوڑ رہا تھا اور کچھ دیر بعد فضا میں بلند ہونے لگا۔ دور مغرب کی سمت تاریکی مسلط تھی اور مشرق روشن ہو رہا تھا۔ اچانک سورج نے اپنا آتشیں سر نکالا اور دھوپ کی پہلی کرن کھڑکی سے گزر کر ہم پر پڑی۔ میں نے پلٹ کر دیکھا۔ ماہ روز سو رہی تھی اور اس کی مسکراہٹ بتا رہی تھی کہ وہ کوئی سمانہ خواب دیکھ رہی ہے۔ میں نے سیٹ بیلٹ کھولی اور سیٹ پھیلا کر لیٹ گیا۔ ہماری منزل کینیڈا تھی مگر میں نے سوچ لیا تھا کہ ہمیں اپنا گھر پاکستان ہی میں بنانا ہے۔ مجھے اس وقت کا انتظار تھا جب حالات میرے لیے مرسکون ہو جاتے اور آغا کی اڑائی ہوئی گرد بیٹھ جاتی پھر نیند چپکے سے میری آنکھوں میں گھس آتی۔

(ماخوذ)

نہیں دے سکوں گا۔ میرے پاس تھوڑی سی رقم ہے۔ میرا کوئی گھر نہیں ہے۔“ اس نے میرے ہونٹوں پر انگلیاں رکھ دیں۔
”مجھے کچھ نہیں چاہیے۔ مجھے تم مل گئے اور ختم ہو گئے۔ سب مل گیا۔“

میں نے اس کی انگلیوں کو چوم لیا اور اس نے جھینپ کر ہاتھ کھینچ لیا۔ ہمارے قریب سے گزرتی ہوئی اتر ہو سٹس مسکرا نے لگی۔

کچھ دیر بعد سیٹ بیلٹ باندھنے اور سگریٹ بجھا دینے کی ہدایت ملیں اور طیارہ ریگننے لگا۔ میں اور ماہ روز ایک دوسرے کی آنکھوں میں دیکھ رہے تھے لہذا ہمیں پتا ہی نہ چلا کہ طیارہ رک گیا تھا۔ اچانک اتر ہو سٹس اور اسٹیورڈ کی بھاگ دوڑ نے مجھے چونکا دیا۔

”یہ طیارہ کیوں رکا ہے۔“ میں نے قریب گزرتی اتر ہو سٹس سے پوچھا۔ اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔

میں نے باہر دیکھا اور پھر میرا خون خشک ہونے لگا۔ ایک پولیس جیب طیارے کی طرف آ رہی تھی۔ میرے ہاتھ پیر سنسنے لگے۔ وہ خطرات جنہیں میں کہیں دور چھوڑ آیا تھا۔ اچانک سامنے آکھڑے ہوئے۔ جیب کے پیچھے سیڑھیوں والی گاڑی بھی تھی۔ جیب رکی اور اس میں سے کچھ وردی پوش اترے۔ اسی اثنا میں طیارے کا دروازہ کھل چکا تھا اور سیڑھی لگائی جا رہی تھی۔

”ماہ روز۔“ مجھے اپنی آواز کسی اندھیرے نما غار سے آتی محسوس ہو رہی تھی۔ ”قسمت ہمارے ساتھ مذاق کر گئی ہے۔“

اس کا چہرہ بھی سفید پڑ گیا۔ میں نے ایک نظر سوئی ہوئی حنا پر ڈالی ”سنو ماہ روز۔ پولیس کے اندر آتے ہی میں فوراً گرفتاری دے دوں گا۔ تم خود کو مجھ سے لا تعلق ظاہر کرنا۔“ میں نے ٹریولر چیک والا لفافہ اس کے پرس میں ڈال دیا۔

”نہیں۔“ اس نے سسکی لی۔
”باگل مت بنو۔ تینوں کے پھنسنے سے بہتر ہے صرف میں ہی گرفتار ہوں۔ تم حنا کو لے کر نکل جاؤ۔ یہ اس معصوم کی زندگی کا بھی سوال ہے۔“ میں نے اسے جھنجھوڑا۔ اس دفعہ اس نے کچھ نہیں کہا صرف سر جھکا کر سسکیاں لیتی رہی۔ جیسے آتی بہار اچانک خزاں میں بدل جاتی ہے۔ ایسا ہی کچھ ہمارے ساتھ ہوا تھا۔ ہمارے سامنے مستقبل کے خواب جو تعبیر سے کچھ ہی دور تھے اچانک صرف خواب رہ گئے تھے۔ میں دیکھ رہا تھا کہ ایک انپکٹر اور اس کے ساتھ دو مزید پولیس والے



ڈاکٹر حامد حسن، ممتاز علی کیانی، عقیل قریشی
محمد سجاد بھٹی، سیف الملوک عباسی، یاسر حسنین
محمد نعمان، ساگر زمان، ناصر محمود بلوچ